ترتیب وتدوین: فرحان رضا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ادب کے چاند تارے

ڈاکٹر قمر عباس

ضابطہ

کتاب	ادب کے چاند تارے
مصنف	ڈاکٹر قمر عباس
حقوق	بحق مصنف محفوظ
تعداد	۵۰۰
طبع	اول
مطبع	پرنٹ ایکسپرٹ، کراچی
سرورق	سید جہانگیر حسین
کمپوزنگ	عباس علی۔ پرنٹ ایکسپرٹ، کراچی
اشاعت	فروری ۲۰۱۷ء
قیمت	۳۵۰ روپے
ناشر	اینگلو لٹریری سوسائٹی

B-18، سائٹ (SITE)، کراچی۔ ۷۵۷۰۰

انتساب

شریکِ سفر کے نام

کہ جس نے

رہِ حیات کی صعوبتوں کو راحتوں

اور

مشکلات و آلام کو

چین اور آرام میں

تبدیل کر دیا۔

زندگی کا کتاب ہونا

یا

کتاب کا زندگی ہونا

بہترین مقصدِ حیات ہے

مشمولات

تبصرے

مضامین

سُخن ہے شرط

ڈاکٹر قمر عباس

اُردو ادب اس نسبت سے، بہت خوش نصیب ہے کہ اُسے نامور شعراء اور ادیب میسّر آئے۔ وہ شعراء اور ادیب کہ جن کی نگارشات نے اُردو کے ادبی چمن میں اپنی تحریروں کی خوش نما کلیوں اور پھولوں سے ایسی مہکار پیدا کی کہ صدیوں بعد بھی شمیم جاں مُعطّر اور فرحت آمیز محسوس ہوتی ہے۔

میں ہمیشہ سے اُردو شاعری اور اُردو نثر کے خوشہ چینوں میں رہا ہوں۔ جیسے اور جہاں سے، اچھی تحریر میسّر آئے، میرا من والہانہ پن کے ساتھ اُسے پڑھنے کا تقاضا قطعاً بالارادہ کرنے لگتا ہے۔ ورق گردانی اور کتاب خوانی کی اس لطیف عادت کے ساتھ کچھ صاحبِ علم حضرات کی صحبت نے حرف، لفظ اور معنی سے رشتہ جوڑنا تمام کاموں سے زیادہ اولیٰ اور مقدم جانا۔ خوش قسمتی سے گزرتے وقت کے ساتھ یہ رشتہ مستحکم سے مستحکم تر ہوتا رہا۔

ہمارے گھرانے میں تہذیب معاشرت کے علاوہ اُردو ادب سے لگاؤ بہت سے دیگر کاموں کے مقابلے میں ترجیحی حیثیت کا حامل رہا ہے۔ میرے نانا (والدہ گرامی کے حقیقی ماموں) سید ماجد حسین مرحوم گوناگوں خوبیوں کی حامل شخصیت تھے۔ سیاست، ادب، مذہب اور سماجی مسائل پر گہری نگاہ تھی۔ تقسیم ہند سے پیشتر حسین آباد، بہار سے تعلیم حاصل کی تھی، جو آج کے مروّجہ نصاب کے مطابق ایم۔اے کے مساوی تسلیم کی جاتی ہے۔ فارسی اور اُردو ادب سے خاص شغف تھا۔ اُن کی قیام گاہ واقع رضویہ سوسائٹی، ناظم آباد میں شعراء، ادیبوں اور دانش وروں کی آمد و رفت کا ایک مستقل سلسلہ تھا۔ "کشکولِ ماجد" کے عنوان سے اپنی زندگی کے مشاہدات اور تجربات پر مبنی کتاب تحریر کی ہے، جو دس جلدوں پر مشتمل ہے۔ اساتذہ کے ہزار ہا اشعار نوکِ زبان تھے، جو گفتگو میں اکثر دُہراتے۔ میرے والد سید افضل علی کو بھی اُردو ادب سے خاص لگاؤ رہا۔ نثر اور نظم کی اچھی کتابیں

ہمیشہ زیر مطالعہ رہیں۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ ان ہی دو شخصیات کے زیر اثر مجھ میں بھی مطالعے کا ذوق بیدار ہوا۔ پھر تو یوں ہوا کہ اُردو شعراء اور خاص طورر پر اساتذہ کے اشعار سے حظ اٹھانے کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ جن شعراء کو زیادہ توجہ سے پڑھا اُن میں میرؔ، خواجہ میر دردؔ، شیخ امام بخش ناسخؔ، خواجہ حیدر علی آتشؔ، نظیرؔ اکبر آبادی، مومنؔ، ذوقؔ، امیرؔ مینائی، مرزا داغؔ دہلوی وغیرہ شامل تھے۔ انیسؔ و دبیرؔ کے مرثیے الگ تہذیب اور تاریخ ہونے کے باعث خصوصی توجہ کا مرکز قرار پائے۔ غالبؔ، اقبالؔ اور جوشؔ مسلسل مطالعے کا تقاضا کرتے رہے، جو آج بھی کسی نہ کسی طرح جاری رہتا ہے۔ ان افراد و اشخاص کے مطالعے کے باعث مصرعوں میں رہنا اور مصرعہ کہنا اچھا معلوم ہونے لگا۔ احساسات کو اظہار کے پیکر میں لانے کے لیے غزل اور نظم نے زیادہ متاثر کیا۔ یوں شاعری سے ایک گونہ اُنسیت پیدا ہو گئی۔ استاذی پروفیسر ڈاکٹر نعیم تقوی مرحوم، جو عالمِ ہفت زباں تھے، مجھ پر بہت مہرباں تھے۔ وہ کسی استاد کا کہا ہوا کوئی مصرعہ دے کر اس پر کلام کہنے کی ہدایت کرتے۔ اسی کے ساتھ مصرعوں پر اصلاح بھی دیا کرتے۔ اور یوں رفتہ رفتہ اچھا خاصا کلام جمع ہو گیا۔ کہا گیا بیشتر کلام بکھری اور منتشر شکل میں اب بھی کہیں نہ کہیں موجود ہے۔ یہ تو اُردو شاعری کا احوال تھا۔ اُدھر اُردو نثر میں حیدر بخش حیدری سے لے کر ڈپٹی نذیر احمد اور شوکت تھانوی سے لے کر عبداللہ حسین تک نثر نگاروں کو دلچسپی سے پڑھا۔ ایک نام جو ہر وقت ذہن کو تازگی اور شادابی عطا کرتا رہا، وہ ابنِ صفی کا تھا۔ زندگی کی اونچ نیچ اور تگ و تاز میں، جب بھی بوجھل ذہن اور تھکے ہوئے جسم نے راحت کی کسی شکل کو ڈھونڈا، وہ ابنِ صفی کے ناول تھے۔

گویا ایک ایسے ادبی پس منظر کے ساتھ ذہن و دل نے پروان چڑھنا شروع کیا۔ ان تمام مشاغل کے پہلو بہ پہلو اخبارات اور خاص طور پر ”روزنامہ جنگ“ سے رشتہ ہر گزرتے دن کے ساتھ مستحکم سے مستحکم تر ہوتا رہا۔ یہ وہ اخبار تھا، جو دیگر اخبارات کی نسبت ہمیشہ میرے مطالعے میں ترجیحی حیثیت کا حامل رہتا اور کہیں نہ کہیں یہ خواہش موجود رہتی کہ میں اس اخبار کا کسی نہ کسی حوالے سے حصّہ بن جاؤں۔ اُردو ادب میں ایم اے کرنے کے بعد حصولِ معاش کے لیے مختلف اداروں میں درخواست دی، جن میں ایک پاکستانی صحافت کا قدیم ترین اور مستحکم ترین ”ادارہ جنگ“ بھی تھا۔

یوں تو ان کے وسطے سے میں اس ادارے سے وابستہ ہو گیا۔ چند برس کے بعد میرا تقرر روزنامہ جنگ، کراچی کے "میگزین سیکشن" میں بطور سب ایڈیٹر ہو گیا۔ اب اخبار کے لیے تسلسل سے لکھنا شوق کے ساتھ دفتری ضرورت بھی بن گیا۔ تراجم، فیچرز، انٹرویوز اور دیگر صفحات مرتب کرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

روزنامہ جنگ کی ادبی خدمات کا سلسلہ قیام پاکستان کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا۔ (اگرچہ اخبار کی اشاعت تقسیم ہند سے بہت پہلے دہلی سے ہو چکی تھی) اخبار نے اپنے ادارتی صفحات پر ابتدا ہی سے نامور شاعروں اور ادیبوں کو جگہ دی اور اخبار کی اس ادا نے قارئین کے دلوں میں جگہ بنا دی۔ مجید لاہوری کے کالم اور رئیس امروہوی کے قطعات گفتگو کا موضوع قرار پانے لگے۔ پھر تو ادیبوں اور شاعروں کی ایک کہکشاں روزنامہ جنگ کے صفحات پر اُتر آئی۔

ادب سے رغبت اور روزنامہ جنگ سے نسبت نے مجھے اس بات پر آمادہ کیا کہ اخبار کی طویل ادبی خدمات کی ایک تاریخ مرتب کی جائے۔ یوں "روزنامہ جنگ کی ادبی خدمات" میری تحقیق کا موضوع بن گیا۔ سال 2014 میں جامعہ کراچی نے تحقیقی کام کے سلسلے میں مجھے ڈاکٹریٹ کی سند عطا کی۔ تحقیقی مقالے کی تکمیل کے بعد دفتری اُمور کے ساتھ اس بات کی بھی تحریک ملی کہ اُردو ادب کے نابغہ روزگار شعراء اور ادیبوں پر مضامین کا ایک سلسلہ قائم کیا جائے۔ چنانچہ اخبار کے ادبی صفحات کے لیے گاہے گاہے مضامین تحریر کرنے کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔

میرے نوجوان دوست، فرحان رضا ادبی لحاظ سے بہت متحرک اور فعال ہیں۔ انیس و دبیر کے مرثیوں کو تحت اللفظ پڑھنا اُن کے سنجیدہ ادبی ذوق کا واضح ثبوت ہے۔ فن تحت اللفظ خوانی کے سلسلے میں ایک کتاب بھی تحریر کر چکے ہیں، جس کی ستائش ممتاز ادیب اور افسانہ نگار، انتظار حسین نے کی ہے۔ وہ مقامی دوا ساز ادارے "ہلکو لیبارٹریز" میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہونے کے ساتھ وہاں کی ادبی تنظیم کے صدر بھی ہیں، اور مختلف عنوانات سے ادبی سرگرمیوں کا انعقاد کرتے رہتے ہیں۔ اچھی کتابوں کی اشاعت اُن کا ایک اور عمدہ کار مشغلہ ہے۔ روزنامہ جنگ میں شائع ہونے والے میرے مضامین کو پڑھتے ہوئے اُن کے ذہن شاداب میں یہ خیال راسخ ہوتا گیا کہ وہ ان

مضامین کو کتابی شکل میں سامنے لائیں۔ اس بات کے پیشِ نظر وہ کتاب کی جلد از جلد اشاعت کے لیے تقاضا اور پیہم تقاضا کرنے لگے۔ میں اُن کی اس پُر خلوص پیش کش کو مسترد کرنے کی کسی بھی کوشش کا حصہ بننا ادبی زیادتی متصور کرتا، لہٰذا حامی بھرنا ہی کارآسان جانا۔ میں انگلو لیبارٹریز کے چیئرمین، جناب سعید اللہ والا کا بھی بے حد ممنون ہوں، کہ انہوں نے کتاب کے مندرجات میں دلچسپی کا اظہار کیا اور اُس کی اشاعت کا کارِ گراں اپنے سر لے کر مجھے سبکدوش کر دیا۔

اب کچھ گفتگو "ادب کے چاند تارے" پر کر لی جائے۔ کتاب کا یہ عنوان اس لیے قرار دیا گیا کہ جن شخصیات پر بھی اظہارِ خیال کیا گیا ہے، اُن کا تعلق کسی نہ کسی حوالے سے ادب سے ہے۔ ان سب کی کچھ نہ کچھ ادبی خدمات ہیں۔ کچھ کی نثری خدمات ہیں، اور کچھ کی شعری۔ گویا یہ سب "ادب کے چاند تارے" ہیں، جو آسمانِ ادب پر روشنیاں بکھیر رہے ہیں اور ان روشنیوں سے چار سُو اُجالا ہی اُجالا ہے۔ ادب شناس ان روشنیوں کو اپنے آس پاس محسوس کر سکتے ہیں۔

ان مضامین میں زیادہ تعداد شعراء اور ادیبوں پر تحریر کیے گئے مضامین کی ہے، اور محض چند ایک وہ ہیں، جو کسی اخباری سلسلے کے موضوع کی بنیاد پر تحریر کیے گئے ہیں۔ ایک آدھ مضمون ایسا بھی ہے، جسے فوری طور پر اشاعت کے لیے دیا گیا تھا، لہٰذا اخباری ضرورت کے تحت اُسے انتہائی مختصر رکھنا پڑا۔ کتاب میں شامل مضامین کے سلسلے میں کہیں کہیں اخبار نے کسی مضمون سے پیشتر کوئی تعارفی تحریر بھی دی ہے، جسے واوین میں درج کیا جا رہا ہے۔ شائع ہونے والے مضامین وہ ہیں، جو کسی شاعر یا ادیب کی ولادت یا وفات کے سلسلے میں تحریر کیے گئے تھے۔

زیرِ نظر مضامین کا تعلق چونکہ ایک اخبار سے تھا، لہٰذا اختصار کا پہلو اس کا پہلی ضرورت قرار پایا۔ مزید براں اس بات کی خاص کوشش کی گئی کہ اُردو ادب کے طالب علموں کو زیادہ سے زیادہ معلومات بہم پہنچائی جائیں۔ سو یہ تمام مضامین اسی مقصدِ تحریر کے تحت معرضِ وجود میں آئے ہیں۔ کتاب میں شامل مضامین اُس ترتیب میں نہیں ہیں، جس ترتیب سے یہ اخبار میں شائع ہوئے تھے۔ موجودہ ترتیب حروفِ تہجی کے اعتبار سے قائم کی گئی ہے۔ کتاب ادب کے تمام قارئین اور طالب علموں کی نذر کی جاتی ہے۔

عرضِ مرتب

فرحان رضا (صدر انکولٹریری سوسائٹی)

جاں عزیز است لیکن بہ سخن جاں نرسد
وائے بر جانِ سخن گر بہ سخنداں نرسد

نرم دم گفتگو گرم دم جستجو، خوش رو، خوش خو، عہد قحط الرجال میں علم و ادب کی امید و آس یعنی میرے دوست ڈاکٹر قمر عباس، کی پیش نظر کتاب ''ادب کے چاند تارے'' درحقیقت ان چاند تاروں کا ذکر خیر ہے جن کے ذکر کے بغیر آسمانِ شعر و ادب تاریک ہے۔ یہ مضامین کوئی ادبی سرقہ نہیں ہیں بلکہ ان مضامین کو ڈاکٹر قمر عباس نے عمیق مطالعے اور دقیق تجزیوں کے بعد سپردِ قرطاس و قلم کیا ہے۔

اس عہد میں کہ جب ہر شخص عجلت میں ہے اور Shortcuts کی تلاش میں ہے ایک شخص پوری دیانتداری و سچائی کے ساتھ صاحبِ قلم ہونے کا حق ادا کر رہا ہے۔ میں واقف ہوں کہ کس طرح قمر عباس اپنی محنت و لگن کے باعث طویل عرصے کے بعد ہمارے ناقص نظامِ تعلیم سے نبرد آزما ہوتے ہوئے ڈاکٹر قمر عباس بن کر ابھرے ہیں۔ یہ وہ عہد ہے کہ جب ہم نے ایک درجن سے زیادہ 'معتبر ہستیوں'' کو رات سوئے اور صبح ''ڈاکٹر'' بنتے دیکھا جن کی بدولت اس لفظ کی حرمت پر آنچ آئی اور جینوئن پی۔ ایچ۔ ڈی ڈاکٹرز کو اس کچی ڈاکٹری کے باعث شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا۔ یا تو وہ گوشہ نشین ہو گئے اور ادبی تقاریب سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور بعض ادبی منظر نامے سے غائب ہو گئے۔ بقول علامہ طالب جوہری

ہر ایک خم میں نشیب و فراز فن تو نہیں
ترا بدن تری آواز کا بدن تو نہیں

سفر ہے شرط تو کیوں ہو رہا ہے یہ احساس
کہ مری چال پہ کچھ لوگ خندہ زن تو نہیں

ان حالات میں ڈاکٹر قمر عباس اردگرد کی آوازوں کو سنی ان سنی کرتے ہوئے اپنے سفر پر گامزن رہے اور بالآخر ان کی جیت ہوئی۔ ان کی کامیابی دراصل ہر سچے ادبی لکھاری کی کامیابی ہے جو اپنا زمانہ آپ بنانے کی جستجو میں ہے۔

ڈاکٹر قمر عباس کی کتاب ''ادب کے چاند تارے'' ان کے مضامین کا مجموعہ ہے اور میں شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے ان مضامین کو مرتب کرنے اور ہمارے ادارے ''اہلکو لٹریری سوسائٹی'' کو ان مضامین کو کتابی صورت میں منصۂ شہود پر لانے کی اجازت دی۔ مضامین کے معیار کا فیصلہ قاری خود کرسکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ بقول جوشؔ

لیلائے شب تار ہے یا حور سحر ہے
جس حال میں ہوں حسن مرے پیش نظر ہے

کے مصداق قاری ''ادب کے چاند تارے'' میں اپنے ''چاند اور تاروں'' کی جھلک ضرور دیکھے گا اور جو اہم گوشے صاحب ذکر کے باب میں ڈاکٹر قمر عباس نے مختلف جہتوں اور اضافتوں کے بعد تحریر کئے ہیں وہ پورے سیاق و سباق کے ساتھ نئے ابعاد تخلیق کرنے میں کامیاب ہوں گے۔

بقول علامہ رشید ترابی

اپنی اضافتوں سے ہے کچھ تازگی رشیدؔ
انسان سن رہا ہے کہانی سنی ہوئی

ڈاکٹر قمر عباس کس حد تک اپنی اضافتوں کی کوشش میں کامیاب ہوئے اس کا فیصلہ آپ کو ان مضامین کو پڑھنے کے بعد کرنا ہوگا جو کہ یقیناً ان کے حق میں ہوگا۔

والسلام

فرحان رضا

تحریکِ احیائے ادب

جناب محمود شام (سابق گروپ ایڈیٹر، روزنامہ جنگ)

ڈاکٹر قمر عباس کو یا تو انیسویں صدی کے وسط میں میرؔ، غالبؔ، مومنؔ، مولوی نذیر احمد کے دور میں زمین پر اُترنا چاہیے تھا۔ یا 22ویں صدی تک اپنی آمد موٴخر کر لیتے۔ اکیسویں صدی کے اس خالصتاً کمرشل ازم، یادتی کی زبان میں کرختداری دور میں وہ بالکل اجنبی سے لگتے ہیں۔ ایسی سوچ جس کا بازار میں کوئی گاہک ہی نہیں ہے۔ ایسے رویے جوان کے ہم نشینوں کو بھی قابلِ قبول نہیں ہوں گے۔ ایسی تحریریں جن کے معیار کو سراہنے والے ابدی نیند سو رہے ہیں۔ برقی ذرائع کے عہد میں ادب اور زبان سب سے زیادہ غیر ضروری خیال کئے جا رہے ہیں۔ وہ دور لد گیا جب اخبار اور اخبار نویس ادب کی کوکھ سے جنم لیتے تھے۔ ان کے اداریوں، کالموں، خبروں میں زبان کی چاشنی ہوتی تھی۔ الفاظ کی بھرمار ہوتی تھی نہ تکرار۔ رہنمائی اور تقویت کے لئے میرؔ، مصحفیؔ، انشاءؔ، سوداؔ، غالبؔ، ذوقؔ، مومنؔ، انیسؔ، دبیرؔ، مولوی نذیر احمد، میر امنؔ، سرشارؔ، چکبستؔ، کنہیا لال کپور، فکر تونسوی، دیوان سنگھ مفتون، ملّا واحدی، جگر مراد آبادی، اصغر گونڈوی، الطاف حسین حالیؔ، سر سید احمد خان، اکبر الہ آبادی، مولانا ظفر علی خان، شورشؔ کاشمیری، مولانا ابو الکلام آزاد، پریم چند، کرشن چندر، رشید احمد صدیقی سے رجوع کیا جاتا تھا۔ یوٹیوب سے نہیں۔

اب ذرائع ابلاغ کی عنان ایسے ہاتھوں میں آگئی ہے، جنہوں نے کبھی قلم نہیں تھاما۔ صرف موبائل فون سے دفتر چلاتے ہیں۔ گھی بنانے والے، سونا فروخت کرنے والے، ڈگریاں بیچنے والے، مضرِ صحت سگریٹ کا کاروبار کرنے والے، والدین سے بھاری فیس ہتھیانے والے اب حروف، آواز اور تصویر کی دنیا میں پیش پیش ہیں۔ ان کی ڈوریاں کہیں اور سے ہلتی ہیں۔ دن رات پتلیاں پُتلے ناچتے ہیں۔ اپنے اپنے ہیڈ کوارٹرز میں بیٹھے ہدایت کار اس بالواسطہ طریقے سے موسم

کے میوے بیچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ایسے میں ڈاکٹر قمر عباس کی ہمت اور جرأت لائق تحسین ہے کہ وہ اس زمانے میں ادب کو موضوع سخن بنا رہے ہیں۔

کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

یہ تحریریں اردو کے سب سے بڑے اخبار میں چھپ کر صرف پاکستان میں ہی نہیں، دنیا میں جہاں جہاں اردو بولی، پڑھی اور سمجھی جاتی ہے۔ وہاں ادب اور قارئین کا ٹوٹا ہوا رشتہ بحال کر رہی ہیں۔ یہ تو مسلمہ امر ہے کہ "جنگ" کی ویب سائٹ دنیا کی ان چار پانچ سائٹس میں شمار کی جاتی ہے، جس پر سب سے زیادہ نظریں قیام کرتی ہیں۔ اردو کی نئی نئی بستیاں زمین کے ایک کونے آسٹریلیا سے دوسرے کونے کینیڈا تک آباد ہو گئی ہیں۔ تلاش رزق میں یہاں پاکستان، ہندوستان کے مختلف علاقوں سے افراد اور خاندان پہنچ رہے ہیں۔ انہیں پھر اپنی ثقافت اور ادبی ورثے کی یاد ستانے لگتی ہے۔ وہاں پاکستان سے بھی زیادہ ادب کی مانگ ہوتی ہے۔ اس لئے میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر قمر عباس کی یہ کاوش ان پردیسیوں کی پیاس بجھانے کا سرچشمہ بھی بن رہی ہوگی۔

زبان، بیان، ادبی محاسن کے تجزیے، تحسین اور تنقید کے لئے تو میں اپنے آپ کو موزوں خیال نہیں کرتا۔ میں نقاد نہیں ہوں۔ ویسے بھی اب اردو ادب میں خالص تنقید نظر نہیں آتی۔ نقاد رہے ہی نہیں ہیں۔ بس جو دو چار ہیں، وہ بھی کسی نہ کسی حلقے کی خوشنودی کے لئے قلم اٹھاتے ہیں۔

ڈاکٹر قمر عباس کے مضامین بڑے مقبول اخبار کے لئے لکھے گئے ہیں۔ اس لئے وہاں حتصار بھی ملحوظ خاطر رکھنا پڑتا ہے۔ اس کے پڑھنے والے، ادبی رسائل والے، خالص ادبی رئین نہیں ہوتے۔ اس لئے عام قارئین کے مزاج کے مطابق زبان بھی آسان رکھی جاتی ہے۔ اور زیادہ مشکل تاویلات میں بھی نہیں الجھا جاتا۔ ڈاکٹر قمر عباس کے ہاں الفاظ کی نشست و خاست، جملوں کی ساخت، اور شخصیات کا انتخاب بہت متوازن ہے۔ ان کی کوشش نظر آتی ہے کہ یورپ میں جس طرح نشاۃ ثانیہ، یا تحریک احیائے علوم کا آغاز ہوا تھا۔ اس سے یورپ شاہراہ

ترقی پر گامزن ہوا۔ ڈاکٹر قمر عباس تحریکِ احیائے ادب کی ابتدا کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ ان ادبی ستاروں کو بلکہ ادب کے آفتاب و ماہتاب چن رہے ہیں، جن سے اخبار کے قارئین کسی نہ کسی طرح آشنا ہیں۔ اس نام آشنائی کو ہی بنیاد بنا کر وہ قاری کو ان کی ادبی خدمات سے روشناس کرنے نکلتے ہیں۔ ادب میں ان کا مقام بھی واضح کرتے ہیں۔ اردو ادب کے سلسلے کو جن شخصیات نے کسی خاص تحریک سے وابستہ کیا۔ یا کسی مخصوص صنف میں طبع آزمائی کی، یا زبان میں نئے تجربے کئے۔ قمر عباس ان سے قدم قدم آگاہ کرتے ہیں۔

عام طور پر کسی ادبی شخصیت کے فن پر بات کرتے ہوئے نقاد ان کے عہد کو زیرِ بحث نہیں لاتے، مگر ان تحریروں میں متعلقہ زمانے کے سیاسی، سماجی اور عمرانی حالات و واقعات کے حوالے بھی دیئے جاتے ہیں۔ ماضی کے تذکرہ نگاروں یا بیسویں صدی کے نقادوں کی طرح مشکل اور بھاری الفاظ استعمال کر کے قارئین کو مبہوت کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ پڑھنے والے کو بہت پیار و محبت سے ادب تخلیق کرنے والی شخصیت کی مختلف جہات سامنے رکھی گئی ہیں۔ آج کے ادب بیزار، زبان گریز معاشرے کو بہت مہارت سے شعر و ادب کے اس طرح قریب لانے کی جدوجہد کی گئی ہے کہ کاروباری دور کے لوگ بھی یہ یقین کریں کہ ادب زندگی کی ایک ضرورت ہے۔ ادب سے معاشرے مزید مہذب ہوتے ہیں۔ شاعر ہوں یا نثر نگار، یا نقاد۔ وہ کسی بھی علاقے کو متمدن اور معتدل بنانے میں مرکزی کردار ادا کرتے ہیں۔ لکھنے کے لئے سوچنا ضروری ہے۔ سوچ ہی کسی قوم کو آگے بڑھنے کا راستہ تراشنے کا محرک بنتی ہے۔ وحشتوں کو ختم کرتی ہے۔ دماغ سے انتہا پسندی کے رجحانات نکال کر میانہ روی کی طرف لاتی ہے۔

ساری تحریریں ہی ان کے خلوص، جستجو اور معروضیت سے مزین ہیں۔ لیکن جوشؔ کے بارے میں ان کے رشحاتِ قلم نے مجھے بہت متاثر کیا۔ میرے علم میں اضافہ بھی کیا ہے۔ جوشؔ صاحب سے، ناصر کاظمی سے، احمد ندیم قاسمی سے ہمیں نیاز حاصل رہا ہے۔ اس لئے ان کے ذکر سے بہت سی یادیں تازہ ہو گئی ہیں۔ شوکت تھانوی، چراغ حسن حسرت کے طنز و مزاح سے نئی نسل کو آگاہ کرنا اردو کی عظیم خدمت ہے۔ کیونکہ وہ ادبی طنز آج کل خال خال ہی رہ گیا ہے۔ بھکو پن ہے یا جگت

بازی ہے۔ پتھر مارے جارہے ہیں۔ حالانکہ پھول مارنے سے بھی کام ہوسکتا ہے۔

ابن صفی کا دور تو کئی سال سے واپس آگیا ہے۔ ابن صفی کی تحریروں نے پھر اپنا قلمی لوہا منوا لیا ہے۔ میرے لئے یہ نئی بات ہے کہ شیخ مجیب الرحمٰن کی والدہ آخر دم تک ابن صفی کے ناولوں کی شیدائی رہیں۔

رئیسؔ امروہوی نے اردو شعر و ادب میں قیمتی اضافے کئے۔ روزانہ قطعہ نگاری ادب کی چاشنی، صحافتی حوالہ اور تاریخ کو شعروں میں قلمبند کرنے کی روایت ڈالی۔ رئیسؔ صاحب کی ذات اور فن کے سارے پہلو وہ بڑی تحقیق اور تلاش کے بعد سامنے لے کر آئے ہیں۔

جنگ گروپ کے بانی، میر خلیل الرحمان کی صحافتی اور ادبی خدمات پر قمر عباس کی تحریر میں بہت سی نئی معلومات اور نئے حوالے ہیں۔

ڈاکٹر قمر عباس لکھتے رہیں۔ تحریکِ احیائے ادب میں مجھ جیسے بہت سے ناکارہ کچھ کرنے کے لئے تیار ہیں۔ آپ کے ساتھ ہیں۔ میں اس بات پر مکمل یقین رکھتا ہوں کہ ادب سے ہی قومیں بنتی ہیں۔ اقبالؔ نے کہا تھا: ''قومیں شاعروں کے ذہن میں جنم لیتی ہیں، اور سیاستدانوں کے ہاتھوں میں دم توڑ دیتی ہیں''۔ آج کل ہم اسی کیفیت سے گزر رہے ہیں۔ طوائف الملوکی کی ترکیب کتابوں میں پڑھی تھی۔ پاکستان اور ہندوستان میں اس کے عملی مظاہرے ہو رہے ہیں۔ ملوکیت بھی ہے، طوائفیں بھی۔

اخبارات، ٹیلی ویژن، سوشل میڈیا میں بھی طوائف الملوکی، انارکی، انتشار کا زور ہے۔ آپ اپنی تحریروں سے اس بے سمت معاشرے کو ادب کی صراطِ مستقیم پر لا رہے ہیں۔ بہت بہت مبارکباد۔

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

بصیرت افروز مضامین

ڈاکٹر محمد رضا کاظمی (مورخ، تنقید نگار، مدرّس)

ڈاکٹر قمر عباس نے لکھا ہے کہ اُن کی پسندیدہ کتاب آبِ حیات ہے۔ محققین اعتراض کرتے ہیں تو اچھی سے اچھی کتاب ادب کے منظر نامے سے غائب ہو جاتی ہے لیکن آبِ حیات اپنے نام کے حسب حال دوام کی نوید رکھتی ہے۔ موضوع دلچسپ اور طرزِ تحریر اس سے بھی زیادہ دلچسپ۔ نثر ایسی کہ اس کا آہنگ اسے شعر کا تاثر دے دے۔ قمر عباس کے ان مضامین میں جمال ہم نشینی کا پورا پورا اثر نمایاں ہے۔ انہوں نے بیسویں صدی کی شاعری کا احاطہ کیا ہے۔ ان کی محفل میں ایک طرف جوشؔ، فانیؔ اور آرزوؔ ہیں اور دوسری طرف اختر شیرانی، ناصر کاظمی اور پروین شاکر ہیں۔ آپ قدم بہ قدم اس چمن کی سیر کریں۔ سب سے پہلے ہماری ملاقات ہوتی ہے جوشؔ ملیح آبادی سے۔ اور عنوان سے ہی ندرت ظاہر ہے: ''جوشؔ کی شاعری میں صوتی اثرات''۔ قمر عباس نے اپنے معروضے کی بنیاد ان الفاظ میں رکھی ہے۔

''صوتی اثرات کسی تصویر یا تخیل کو ابھارنے میں بہت مدد دیتے ہیں اور بعض اوقات تو محض صوتی اثرات ہی سے کسی واقعہ یا منظر کی صحیح عکاسی کی جا سکتی ہے۔''

ڈاکٹر قمر عباس نے بہت ہی برمحل مثالوں سے صوتی اثر کی تعریف کی ہے۔ ایک طرف وہ ایسے جملے نقل کرتے ہیں جن سے بغیر صوتی اثر کے، مطلب کی ادائیگی ہو جاتی ہے مثلاً

''اچانک گولیاں برسنے لگیں''

''اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے''

''گھنگھرو بجنے لگے''

انہی جملوں کو جب وہ صوتی اثر کے ساتھ دہراتے ہیں تو ادائے مطلب میں برجستگی بھی آجاتی ہے اور بلاغت بھی اور جملے ذہن تک آ کے رکتے نہیں، حواس پر چھا جاتے ہیں، جس سے تخلیقی نثر کے اثرات واضح ہونے لگتے ہیں۔ اسی ترتیب سے ان جملوں کو دیکھئے:

"اچانک تڑاتڑ گولیاں برسنے لگیں"
"اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے"
"چھما چھم گھنگھرو بجنے لگے"

اپنا مقدمہ قائم کرنے کے بعد ڈاکٹر قمر عباس صوتی اثر کی مثالیں اساتذہ سے دیتے ہیں جن میں سب سے نمایاں نظیر اکبر آبادی ہیں

ہیں اس ہوا میں کیا کیا برسات کی بہاریں
سبزوں کی لہلہاہٹ باغات کی بہاریں
بوندوں کی جھمجھاوٹ قطرات کی بہاریں
ہر بات کے تماشے ہر گھات کی بہاریں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ جوش کے نزدیک نظیر اکبر آبادی اردو کے سب سے عظیم شاعر ہیں۔ چنانچہ اپنے تخلیقی عمل میں، جیسا کہ قمر عباس نے دکھایا ہے، جوش نے اسی روش پر چل کر زیادہ دلآویزی پیدا کی ہے۔ زیادہ سامنے کی مثال تھی "آہا آ ہا برکھا آئی" مگر قمر عباس نے تفریق کے ساتھ مثال دینے کے لئے مسدس کے اس بند کو چنا ہے:

ٹپ ٹپ شرر شرار تڑاتڑ چھنن چھنن
دھمال دھوم دھام دما دم دھنن دھنن

گم کاو ردم جھوم جھما جھم جھنن جھنن
گھن گھن گرج گھما ؤ گھما سم گھنن گھنن
ہول و ہراس و ہیبت و ہیجاں لئے ہوئے
بجلی کی تیغ، نوح کا طوفاں لیے ہوئے

صوتی اثر کی نسبت سے جو دوسرے شاعر ہیں انہیں کہا جاتا تھا آرزو لکھنوی۔ اصغر حسین شور، آغا حشر کاشمیری اور کدار شرمن کے دوش بدوش آرزو لکھنوی، نیو تھیٹرز کلکتہ کی فلموں کے لئے گانے لکھتے تھے اور ان سب گیت نگاروں میں آرزو کا قد نکلتا تھا۔ آرزو لکھنوی کی خصوصیت خاصہ کو ڈاکٹر قمر عباس نے ان الفاظ میں دہرایا ہے:

"آرزو کا انداز کلام سادہ اور برجستہ ہے۔ کلام میں ہندی الفاظ کی آمیزش اسے مزید سحر کار بنا دیتی ہے۔ ہندی کے میٹھے اور رسیلے الفاظ ان کے مجموعۂ کلام 'سُریلی بانسری' میں درجۂ کمال پر نظر آتے ہیں۔"

قمر عباس نے اپنے مضمون میں آرزو کے بہت سے مشہور اشعار بھی نقل کئے ہیں مگر خاص اس وصف کے تحت جو اشعار نقل کئے ہیں، ان میں سے دو یہ ہیں:

آپس کی کشاکش کیا سہتا نازک تھا تعلق الفت کا
وہ مجھ سے کھنچے میں ان سے کھنچا بس بیچ سے رشتہ ٹوٹ گیا

جو رو دو تو ہنس دے جو چپ ہو تو چھیڑے
پڑا ہو گا کاہے کو ایسے سے پالا

پہلا شعر روایتی عشقیہ شاعری کے تحت رکھا تو جا سکتا ہے لیکن یہاں معاملہ بندی سے گھریلو معاشرت کا اشارہ ملتا ہے۔ دوسرے شعر میں معشوق خاموش نہیں شوخ ہے جس سے شعر کا تاثر سرتاپا شوخ ہو جاتا ہے۔ اس پیرائے میں قمر عباس ہمیں بتاتے ہیں کہ آرزو لکھنؤ سے کچھ دور اور

ضیا برج سے کچھ قریب ہو گئے ہیں۔

ایک اور معتبر ہم عصر فانی تھے۔ قمر عباس اس پہلو پر زور دیتے ہیں کہ فانی ہم عصر تھے اقبال و جوش جیسے نظم نگار شعراء کے۔ یہ صرف نظم گو ہی نہیں رجائی طرز احساس کے شاعر تھے ایسے میں فانی کا افسردہ تغزل اپنی جگہ کیسے بنا گیا؟ ڈاکٹر قمر عباس نے اس کا جواب درج ذیل الفاظ میں دیا ہے:

"ایسے میں کسی غم نصیب کے نوحے کو سنتا تو کون سنتا۔ مگر فانی اپنی بے سروسامانی کے بجائے اپنے سوز نہانی کو ہتھیار اور گلے کا ہار سمجھ کر، شاعری کی زبان میں کچھ ایسے گویا ہوئے کہ ان کی قوت گویائی ان کو خوب راس آئی۔"

فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

قریب کی نسل میں آغا حشر اور مجنوں گورکھپوری بھی تھے (اور جو کلکتہ میں ملے بھی تھے) آغا حشر کی تمثیل نگاری اور مجنوں گورکھپوری کی تنقید نگاری نے ان کے شعری اوصاف پر پردہ ڈال دیا۔ یہاں قمر عباس نے پردہ اٹھایا ہے۔ آغا حشر کاشمیری کے ڈرامے ذرا شوخ اور غنائی آہنگ لئے ہوئے تھے۔ جس طرح مثنوی کے درمیان غزل کے شعر ڈگنا اثر دکھاتے ہیں، اسی طرح تمثیل کے تقاضوں کو نظر میں رکھ کر آغا حشر شعر کہا کرتے تھے۔ قمر عباس ان کے اساسی اسلوب تک پہنچاتے ہیں۔

ہاں ساقی میخانہ بھر دے مرا پیمانہ
بد مست گھٹا ہے یا اڑتا ہوا مے خانہ

ہوتی ہیں شب غم میں یوں دل سے مری باتیں
جس طرح سے سمجھائے دیوانے کو دیوانہ

کیا تم نے کہا دل سے کیا دل نے کہا مجھ سے
بیٹھو تو سنا دوں میں اک روز یہ افسانہ

آپ نے دیکھا کہ غزل میں بھی مکالمے کی فضا قائم ہے۔ ہمیں قمر عباس کو حسن انتخاب کی داد دینی چاہیے۔ آغا حشر سے زیادہ قمر عباس مجنوں گورکھپوری کے شعری اوصاف کو نمایاں کرتے ہیں۔ نقاد کی شاعری یہ ہوتی ہے کہ ہمہ وقت اس کا ذہن کلامِ اساتذہ میں محو رہتا ہے اس لئے انفرادی آہنگ کو پالینا اس کے لئے زیادہ مشکل ہے۔ قمر عباس مجنوں گورکھپوری کے فکری آہنگ تک ہمیں لے جاتے ہیں:

ہنوز دم کے الجھنے میں کچھ کمی نہ ہوئی
کوئی نہ کوئی گریباں میں تار باقی ہے

بچے تھے پھول جو، مرجھا کے رہ گئے سارے
مگر ابھی خلشِ نوکِ خار باقی ہے

یہ استاد یگانہ، بیتاب عظیم آبادی کی زمین تھی اور مجنوں نے تمام اساتذۂ عظیم آبادی کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ مجنوں تقریباً آغا حشر کے آخری زمانے میں کلکتہ پہنچے تھے، یہاں کلکتے سے نسبت رکھنے والے ایک اور ادیب بھی اس نگارخانے میں موجود ہیں۔ چراغ حسن حسرت جو کلکتہ میں صحافت سے وابستہ تھے۔ پہلی بار مولانا ابوالکلام آزاد کے طلب کرنے پر دوبارہ ۱۹۲۵ء میں جب وہ پہلے "نئی دنیا" اور پھر "عصرِ جدید" سے وابستہ ہو گئے۔ چراغ حسن حسرت کے بعض اشعار تو زباں زد ہو گئے

رات کی بات کا مذکور ہی کیا
چھوڑیے! رات گئی بات گئی

غیروں سے کہا تم نے غیروں سے سنا تم نے
کچھ ہم سے کہا ہوتا کچھ ہم سے سنا ہوتا

مزاحیہ کالم نگاری سے مشخص ادیب اپنی طبیعت میں شعر گوئی کا ایسا ملکہ رکھتا تھا ناقابل یقین سی بات ہے! نثر کی انجمن ہو یا بزمِ سخن ہو۔ عام طور سے ابن صفی کا وہاں سے ذکر نہیں۔ لیکن ڈاکٹر قمر عباس ابن صفی اور ان کی جاسوسی دنیا کی ابلاغی قوت کا پورا پورا ادراک رکھتے تھے اگر چہ خود ابن صفی کا موقف کیا تھا اسے قمر عباس فراموش نہیں کرتے۔

جو کہہ گئے وہی ٹھہرا ہمارا فن اسرار
جو کہہ نہ پائے نہ جانے وہ بات کیا ہوتی

بس اس مضمون کی ایک جھلک دیکھئے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ قمر عباس نے کس قدر قریب ہو کر اور کس انہماک سے یہ مضمون لکھا ہے۔

''ابن صفی جب مجنوں گورکھپوری سے ملاقات کے لئے پہنچے تو انہوں نے کہا کہ تم اپنے ناولوں میں ''تشویش کن'' کا لفظ غلط استعمال کرتے ہو۔ ابن صفی نے جواب دیا کہ آپ جیسا عالم میرے ناول پڑھتا ہے۔ یہی میرا سب سے بڑا اعزاز ہے''۔

ڈاکٹر قمر عباس رومانی اور جذباتی شاعری سے کیسے برتاؤ کرتے ہیں۔ اس کی جھلک ہمیں اختر شیرانی، ناصر کاظمی اور پروین شاکر پہ لکھے مضامین میں نظر آتی ہے۔ اختر شیرانی کے مزاج سخن کے بارے میں قمر عباس کے درج ذیل الفاظ کلیدی ہیں اور یوں اہم ہیں کہ انہیں بے کم و کاست بیان کر دیا گیا ہے

''اختر شیرانی چلتے چلتے ایک اور ہی دنیا میں جا پہنچے، وہ دنیا جہاں ان کے لئے خارجی معاملات کا رعبث کی حیثیت اختیار کر گئے''

ساتھ ہی قمر عباس نے ان حادثات کی نشاندہی کی ہے جن کے سبب اختر شیرانی ذہنی قرار سے کبھی نکل ہی نہیں سکے۔ کمسن بیٹے کی موت، داماد کی غرق آبادی اور ایک ہم دم دیرینہ کی موت۔ غرض انہوں نے دونوں جانب سے اختر شیرانی کا جائزہ لیا ہے اور چند خطوط سے ہی انہوں نے

ہمیں ایک مکمل تصویر تھما دی ہے۔

قمر عباس کے مطابق ناصر کاظمی اول اول اختر شیرانی ہی کے رنگ میں شعر کہتے تھے مگر حالات نے جو پلٹا لیا، اس کے سبب ناصر کے طرز کلام میں تبدیلی واقع ہو گئی۔ اور ناصر کاظمی کی مقبولیت کا دور شروع ہوتا ہے اختر شیرانی کی وفات کے بعد (۱۹۴۸ء)۔ ناصر کاظمی بیشتر غزل سے مانوس تھے اور میر سے ان کی طبعی نسبت اگر چہ ان کی شہرت میں بہت معاون تھی ان کے کلام کی تعین قدر (Evaluation) میں مشکل تھی۔ تاہم قمر عباس ان کے قریب آ ہی جاتے ہیں۔

''کارِ غزل ناصر کے لئے اپنے کو بازیافت کرنے کا عمل تھا۔ ایک ایسا عمل جس سے گزرنا اور جس کو برتنا ہر حساس دل کی خواہش ہوتی ہے، مگر جس کا بیان، تجربے کی سان کا محتاج ہوتا ہے، جس سے ناصر خوب واقف تھے۔''

یاد ہیں مرحلے محبت کے
ہائے اس بے کلی میں کیا کچھ تھا

ناصر کاظمی کی جس دوسری خصوصیت کی قمر عباس نے نشاندہی کی ہے وہ ہے آثار فطرت سے محبت۔ خارجی فطرت سے رغبت نظیر کی عطا ہے اور داخلی فطرت سے رغبت میر کی۔ ایک تو نظم کو غزل میں لانا قمر عباس بالفاظ دیگر بتا رہے ہیں کہ ناصر کاظمی نے نظیر کو میر کے قالب میں ڈھال لیا تھا۔

جب ذرا تیز ہوا ہوتی ہے
کتنی سنسان فضا ہوتی ہے

اگر چہ درمیان میں بہت سارے مضامین ہیں مگر معنوی طور پر جو اس مجموعہ مضامین کا مقطع ہے، وہ ہے پروین شاکر پہ ان کا مضمون:

''اب وہ ایسی شاعرہ کے روپ میں افق شعر پہ آئی جس نے نسوانی لہجے کو ایک ایسی شناخت عطا کی جس سے اردو شاعری اب تک محروم تھی۔''

مگر قمر عباس بہت جلد اس لہجے تک پہنچ جاتے ہیں جو شیرینی سے تلخی کی جانب سفر کر رہا تھا۔

مرا نوحہ کناں کوئی نہیں ہے
سو اپنے سوگ میں خود بال کھولوں

شعر اپنی تاثیر میں تو اعلیٰ ہے مگر واقعیت کے لحاظ سے غلط۔ اس ضمن میں قمر عباس نے مرحومہ کی مقبولیت میں ٹیلی ویژن کے کردار کا بھی ذکر کیا ہے تاہم موت کے بعد ۲۲ سال کا طویل وقفہ ثابت کرتا ہے کہ پروین شاکر کا دوام کلام پر منحصر تھا، جمال پر نہیں۔

ڈاکٹر قمر عباس نے ابتدائیہ میں وضاحت کی ہے کہ یہ مضامین اخبار کے لئے لکھے گئے ہیں جن کی شرط اولین اختصار ہے اس کے ساتھ ساتھ ابلاغ کے دائرے کو وسیع تر کرنے کے لئے انہوں نے حتی الامکان آسان انداز اختیار کیا ہے۔ اس کے باوجود یہاں تسکین ذوق، صحت مند اقدار اور بصیرت افروزی کا سامان موجود ہے جو بذاتہ ایک مبارک قدم ہے اور ہماری دعا یہ ہے کہ یہ پہلا ہی قدم ہو۔

☆☆☆☆☆

تخلیقی اور تنقیدی وصف کے آئینہ دار مضامین

جناب خواجہ رضی حیدر (شاعر، ادیب، محقق)

ڈاکٹر قمر عباس اگرچہ صحافی ہیں لیکن شعروادب کے ذوق اور مطالعے نے اُن کے اندر ایک ایسی ذوقی بصیرت اور توانائی کو فروغ دے دیا ہے کہ شعروادب کے حوالے سے وہ کسی بھی موضوع پر منطقی استدلال کے ساتھ نہایت معلومات افزا گفتگو کرتے ہیں۔ ایسی گفتگو جو سامع کے اندر بھی تفہیم کے نت نئے دَر وا کرتی رہتی ہے۔ اپنی اس گفتگو کو جب وہ سینۂ قرطاس پر منتقل کرتے ہیں تو نہ صرف معنی کو وسعت مل جاتی ہے بلکہ اُن کی تحریر میں موجود انشائی حسن ایک واضح مطالعاتی کشش کو فروغ دیتا ہے۔ جس کی بنا پر اُن کا قاری باآسانی نہ صرف مضمون پڑھ لیتا ہے بلکہ تحریر کی مقصدیت اور معنویت بھی اُس پر عیاں ہو جاتی ہے۔ شاعروں اور ادیبوں کے حوالے سے روزنامہ جنگ کراچی میں اُن کے متعدد مضامین میری نگاہ سے گزر چکے تھے، اب ان مضامین پر مشتمل اُن کی کتاب ''ادب کے چاند تارے'' شائع ہو رہی ہے، جو یقیناً اُردو ادب میں ایک اہم اضافہ ثابت ہوگی، کیونکہ یہ مضامین براوراست اظہار کا ایک عمدہ نمونہ ہیں۔ ان مضامین کے مطالعے سے جو بات میرے ذہن میں سب سے پہلے آئی وہ یہ تھی کہ ڈاکٹر قمر عباس کی تحریر میں موجود انشائی حسن اپنی جگہ لیکن اُن کی تنقیدی بصیرت اور تحقیقی تن دہی بھی اُن کے مضامین کو معتبر بناتی ہے۔ بلاشبہ یہ مضامین اپنے مواد کے اعتبار سے سوانحی بھی ہیں اور تشریحی بھی، مگر یہ مضامین اپنی ایک مخصوص ادبی حیثیت رکھتے ہوئے بھی سب کے لئے ہیں۔ یعنی عام قاری بھی ان کا نہ صرف باآسانی مطالعہ کر سکتا ہے، بلکہ یہ مضامین اپنے قاری کو ادب کے باقاعدہ مطالعے پر آمادہ بھی کرتے ہیں۔ کسی بھی تحریر کی یہ بڑی خوبی ہوتی ہے کہ وہ خود کو پڑھوا لے۔ مجھے یہ خوبی ڈاکٹر قمر عباس کے مضامین میں بدرجۂ اتم دکھائی دیتی ہے۔

ڈاکٹر قمر عباس کے بعض مضامین خود وضاحتی ہیں لیکن بعض مضامین معلوماتی اور سوانحی ہونے کے باوجود بھی تنقیدی مضامین کے دائرے میں آگئے ہیں۔ یہ مضامین بڑے اہم ہیں۔ خاص طور پر "جوشؔ کی شاعری میں صوتی اثرات"؛ "سریلی بانسری کا خالق آرزو لکھنوی"، "آغا حشر اُردو ڈرامہ نگاری کا ناقابلِ فراموش کردار" "ادب زندگی کا مجنوںؔ"؛ "ادب اور صحافت کا چراغ: چراغ حسن حسرت"؛ "شعرائے اُردو کے حریت پسندانہ کلام کا ایک جائزہ"؛ "میر انیس: تہذیب سخن کا معجز نما شاعر"؛ "فکر و دانش کی ایک توانا آواز سید محمد تقی" ایسے مضامین ہیں جن کو تنقید و تخلیق کے کسی بھی معیار پر پرکھا جائے وہ اپنی ایک علیحدہ ادبی حیثیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر قمر عباس نے انتہائی مہارت کے ساتھ بہت خوبصورت انداز میں کلیہ سازی بھی کی ہے۔ خصوصاً میر انیسؔ کے بارے میں انہوں نے جو مضمون لکھا ہے اُس میں یہ خوبی جامع اور موثر دکھائی دیتی ہے۔ وہ مضمون آغاز کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "اگر شاعری سماج پر اور افراد پر مثبت اثرات مرتب کرتی ہے تو ستائش کے قابل ہے۔ اگر شاعری سے جذبۂ ایثار و قربانی بیدار ہوتا ہے تو اُسے اپنانا چاہیے۔ اگر شاعری سے زبان و بیان درست ہوتی ہے تو اُسے ضرور پڑھنا چاہیے۔ اگر شاعری سے رشتوں ناتوں، ادب و آداب اور حفظِ مراتب سے واقفیت ہوتی ہے تو اُسے توجہ سے سمجھنا چاہیے۔ اگر شاعری سے اخلاقی مفاسد دور ہوتے ہیں تو اُسے اپنے سے قریب کرنا چاہیے اور اگر شاعری سے کوئی سبق حاصل ہوتا ہے تو اُسے کارآمد جاننا چاہیے"۔ یہ اور اس قسم کے بہت سے جملے اُن کے مضامین میں سجے ہوئے ہیں جس سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر قمر عباس بوقت تحریر اپنے تخلیقی وصف کو بھی خوبصورتی کے ساتھ اجاگر کرتے چلے جاتے ہیں۔ کسی نثر نگار میں یہ خوبی ریاض، مسلسل محنت اور مطالعے کی فراوانی سے پیدا ہوتی ہے۔ میں ڈاکٹر قمر عباس کو مضامین کے اس مجموعے کی اشاعت پر مبارکباد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ یہ مجموعۂ مضامین ادب کی تفہیم میں نئی نسل کے لئے یقیناً مفید ثابت ہوگا۔

☆☆☆☆☆
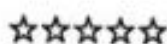
طرزِ تحریر کا جادو

جناب عقیل عباس جعفری (شاعر، ادیب، محقق)

ڈاکٹر قمر عباس علمی وادبی حلقوں میں اپنی تنقیدی بصیرت اور تحریروں کے حوالے سے جداگانہ شناخت رکھتے ہیں اور ادبی تحقیق کے بحرِ ذخار سے جو کچھ حاصل کرتے ہیں اسے وسیع ادبی حلقے تک پہنچانا اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں اور اس کے لیے وہ روزنامہ جنگ کے توسط سے اپنی معلومات اور تاثرات عوام تک پہنچانے کا ہنر جانتے ہیں۔ یہ کمال بھی کسی کسی ہی کو حاصل ہوتا ہے کہ سخن وران اور معماران ادب کی پرآشوب زندگی اور ان کے فنی کمالات اور شاہ کاروں کو منتخب کر کے عوامی اسلوب میں تحریر کرے اور سب کے دلوں میں اپنی جگہ بنائے۔

ڈاکٹر قمر عباس کے مضامین کے اس مجموعے میں ۲۸ مضامین شامل ہیں جن میں تمام مضامین ہی اپنی اپنی جگہ اہمیت کے حامل ہیں۔ عبداللہ حسین، پروین شاکر، میر خلیل الرحمٰن، ابن صفی، الطاف حسین حالی کے حوالے سے مضامین سوانحی حوالے سے زیادہ اہم ہیں۔

اس کتاب کے اہم مضامین میں ''جوش کی شاعری میں صوتی اثرات''، ''آبِ حیات اور محمد حسین آزاد''، ''رجائیت پسندی کی آواز: فیض'' شامل ہیں جس میں قمر عباس کو تحقیقی اور تنقیدی بصیرت اور طرزِ تحریر کا جادو ہر قاری کو اپنے اسلوب کا اسیر بنالیتا ہے۔ ایک اور اہم مضمون ''صبح آزادی کی مقدس کرن'' ہے جس میں ان تمام اعتراضات کا جواب دے دیا ہے جو اردو شاعری یا خصوصاً اردو غزل پر کیے جاتے رہے ہیں اس مضمون میں قمر عباس نے اردو شعرا کی حریت پسندی اور غزل میں جدوجہد آزادی کے اظہار کے جواہر ریزے پیش کر کے اردو کے وسیع ترمیلانات اور رجحانات کی عکاسی کی ہے۔

ابھی قمر عباس کو اپنے ریاض کی بہت سی منزلیں طے کرنا ہیں۔ ان کا ادبی مستقبل بہت روشن

ہے۔ جب وہ یہ منزلیں طے کریں گے تو ہم فخر سے کہہ سکیں گے کہ ہم بھی ان سے محبت کرنے والوں میں شامل تھے۔

ڈاکٹر قمر عباس ایک ادبی اور علمی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں جس کی جھلک ان کے اسلوب تحریر میں نمایاں نظر آتی ہے۔ کراچی کا ادبی افق ایک طویل عرصے سے کسی تذکرہ نگار اور نقاد کی آمد کا منتظر تھا۔ میں ڈاکٹر قمر عباس کو اس ادبی افق پر خوش آمدید کہتا ہوں۔

نئے دیوانوں کو دیکھیں تو خوشی ہوتی ہے
ہم بھی ایسے ہی تھے جب آئے تھے ویرانے میں

عقیل عباس جعفری

آرزو لکھنوی

سُریلی بانسری کا خالق

لکھنؤ کا نام ذہن میں آتے ہی تہذیب وتمدن، علوم وفنون اور زبان وادب کے صدہا دریچے خود بخود کھلتے چلے جاتے ہیں۔ تمام باتوں سے صرف نظر کرتے ہوئے، اہل لکھنؤ کی اگر صرف اسی ادا پر غور کرلیا جائے کہ انہوں نے زبان وادب کی جس طرح آبیاری کی اور زمین شعرو سخن میں جتنی گل کاری کی، اُس نے اُردو شعروادب کو نہ صرف مالا مال کیا، بلکہ لازوال کردیا۔ شیخ امام بخش ناسخ کی اصلاحِ زبان ہو یا میر انیسؔ کے مرثیوں کی آن بان اور شان۔ لکھنؤ اپنی انفرادیت قائم رکھتا ہے۔ اُردو شاعری کے مسلم الثبوت استاد، امیرؔ مینائی، لکھنؤ کی محبت کے کچھ اس طرح اسیر تھے کہ کہتے تھے

کہاں ہوں گی امیرؔ ایسی ادائیں حور و غلماں میں
رہے گا یاد ہم کو خلد میں بھی لکھنؤ برسوں

سو، اسی لکھنؤ کی مٹی سے جنم لینے والے ایک شاعر، آرزو لکھنوی بھی تھے، جو 1873 کو پیدا ہوئے۔ آرزوؔ کا نام سید انور حسین تھا۔ اُن کے والد میرزا کر حسین یاسؔ کہنہ مشق شاعر تھے۔ یاسؔ نے شاعری میں دو اساتذۂ سخن سے اصلاح لی اور دونوں باکمال شعراء تھے۔

اوّل میر مونسؔ، جن کا یہ شعر اُردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

نہ تڑپنے کی اجازت ہے، نہ فریاد کی ہے
گھٹ کے مر جاؤں، یہ مرضی مرے صیّاد کی ہے

اور دوم جلالؔ لکھنوی

اُٹھ گئی تھیں کہیں اُس شوخ کی نیچی نظریں
دیر تک ہم نے، دو عالم تہ و بالا دیکھا

اب یاس کی مستقبل کی آس، اُن کا بیٹا، آرزوؔ قرار پایا۔ آرزوؔ نے بارہ برس کی عمر سے شعر گوئی کا آغاز کیا۔ اپنے والد کے توسط سے اُن کے شعر گوئی کے استاد جلالؔ لکھنوی کے شاگرد ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب لکھنؤ علمی و ادبی سرگرمیوں کا مرکز مانا جاتا تھا۔ آئے دن مشاعروں کا انعقاد، بزرگ شعراء کے لئے رحمت اور نو آموز شعراء کے لئے ریاضت کا درجہ رکھتا تھا۔ آرزوؔ نے جس غزل سے شعری سفر کا آغاز کیا، اُس کا مطلع تھا

ہمارا ذکر، جو ظالم کی انجمن میں نہیں
جبھی تو درد کا پہلو، کسی سخن میں نہیں

جلالؔ کو جب اندازہ ہو چکا کہ شاگرد علمِ عروض میں کامل ہو کر عرضِ گفتار میں پختہ کار ہو چکا ہے اور اصلاح لینے کے بجائے اصلاح دینے کی منزل پر پہنچ چکا ہے، تو اپنے چند شاگرد بھی آرزوؔ کو سونپ دیئے۔ آرزوؔ نے استاد کے حکم کو مقدم جانا اور برسوں یہ خدمت انجام دی۔ یہاں تک کہ 1909 میں جلالؔ کے انتقال کے بعد اُن کے جانشین قرار پائے۔ اب آرزوؔ اُردو شاعری کے میدان میں جگمگانے لگے۔

کس نے بھیگے ہوئے بالوں سے، یہ جھٹکا پانی
جھوم کے آئی گھٹا، ٹوٹ کے برسا پانی

آپس کی کشاکش کیا سہتا، نازک تھا تعلق اُلفت کا
وہ مجھ سے کھنچے، میں اُن سے کھنچا، بس بیچ سے رشتہ ٹوٹ گیا

جس نے حالت یہ بنائی، وہ بھی آج اے آرزو
چہرۂ بیمار سے، چادر ہٹا کر رو دیا

بڑے مزے کے تھے الزام، گرچہ جھوٹے تھے
پھر آج ہاں کوئی ٹکڑا، اُسی فسانے کا

آرزو کو موسیقی سے بھی لگاؤ تھا۔ جب لکھنؤ کے آسودہ حالی کے دن خواب ہوئے اور معاش کے مسائل پابہ رکاب ہوئے تو لکھنؤ کو خیر باد کہا اور کلکتہ (اب کول کتہ) پہنچ کر "مدن تھیٹرز" سے وابستہ ہوئے، جہاں ایک فلمی کمپنی کے لئے گیت، مکالے اور نغمے تحریر کرنے کی خدمات انجام دینے لگے۔ کلکتے سے سفر کر کے بمبئی (اب ممبئی) جا پہنچے، جہاں فلمی صنعت خوب پھل پھول رہی تھی۔ اپنی قادر الکلامی کے باعث انہیں مسلسل کام میں منہمک رہنا پڑا، یوں ایک بار پھر مالی آسودگی حاصل ہوئی۔ "سازِ حیات" میں چند ایسی غزلیں ہیں، جن میں موسیقی اور شاعری کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ "جیون سرود" گیتوں پر مبنی کلام ہے۔
البتہ تمام تر معاشی مشغولیت اور مصروفیت کے باوجود غزل گوئی کا سفر ہنوز جاری تھا۔ وہ غزل، جس نے آرزو کو شناخت عطا کی تھی۔

پردے کی جنبشوں میں بھی لہریں تھیں حُسن کی
جو دیکھنا تھا، اہلِ نظر دیکھتے رہے

ہے نگاہِ باغباں میں، آج بجلی کی چمک
ہم صفیرو، اپنے اپنے آشیاں سے ہوشیار

اُمنگ تھی یہ جوانی کی یا کوئی آندھی
ملا کے خاک میں ہم کو، گئی بہار کہاں

ہاتھ سے کس نے ساغر پٹکا، موسم کی بے کیفی پر
اتنا برسا ٹوٹ کے بادل، ڈوب چلا میخانہ بھی

آرزو کا اندازِ بیان سادہ اور برجستہ ہے۔ کلام میں ہندی الفاظ کی آمیزش اُسے مزید سحر کار بنا دیتی ہے۔ ہندی کے میٹھے اور رسیلے الفاظ اُن کے مجموعۂ کلام "سُریلی بانسری" میں درجۂ کمال پر نظر آتے ہیں۔ آرزو اسے "خالص اُردو" قرار دیتے ہیں۔

رس ہی رس جن میں ہے، اور سیل ذرا سی بھی نہیں
مانگتا ہے کہیں ،اُن آنکھوں کا مارا، پانی

وہ آرزو ،اب تک تو کلیجے پہ ہرا ہے
چرکا، جو لبھاتی ہوئی، چتون نے دیا ہے

دیکھنے کو، جو اِن آنکھوں کے، ترس جائے گا
جی تو اک پھول ہے کمھلا کے بکس جائے گا

جو رو دو، تو ہنس دے ،جو چپ ہو، تو چھیڑے
پڑا ہو گا کاہے کو، ایسے سے پالا

آرزو نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی۔ غزل، قصیدہ، نعت، سلام، مرثیہ، رباعی، قطعہ، مثنوی، گیت نگاری وغیرہ۔ نظم و نثر پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ فغانِ آرزو، جہانِ آرزو، زبانِ آرزو، سُریلی بانسری، نشانِ آرزو، میزان الحروف، نظامِ اردو (زبان کی ساخت، مزاج، لوچ، لچک، سلاست و روانی کے معاملات پر مبنی کتاب) عدلِ محمود، صبح بنارس، دُردانہ (مثنویاں) ثمرۂ متحیرہ، اربعہ عناصر (مجموعۂ مراثی) صحیفۂ الہام (سلاموں کا مجموعہ) صبح اسلام (نعتیہ مسدس) نظم و نثر کے کمالات ہیں۔ 18 اپریل 1951 کی اشاعت میں روزنامہ جنگ نے اُن کی وفات پر ادارتی شذرہ تحریر کیا۔ سال 1951 میں شعر و ادب کی نامور شخصیات رحلت کر گئیں۔ تاجور نجیب

آبادی، سیماب اکبرآبادی، آرزو لکھنوی اور حسرت موہانی وہ شعراء تھے، جو دنیا سے سدھارے۔ قطعہ نگاری کی تاریخ کے بے بدل شاعر، رئیس امروہوی نے 15 مئی 1951 کو روزنامہ جنگ کے لئے جو قطعہ تحریر کیا، وہ اپنی مثال آپ ہے۔

نامور شاعروں کی یہ اموات
سخت نازک معاملہ ہے کوئی
کیوں یکے بعد دیگرے رحلت
خلد میں کیا مشاعرہ ہے کوئی

☆☆☆☆☆

(۲)

آغا حشر: اُردو ڈراما نگاری کا ناقابل فراموش کردار

اُردو اصنافِ سخن میں ڈراما نگاری کو یوں منفرد حیثیت حاصل ہے کہ اس میں کہانی کو کرداروں کی صورت میں چلتا پھرتا دیکھا جا سکتا ہے۔ شاعری، افسانہ، قصہ گوئی، ناول اور دیگر اصناف اس عنوان سے قاری پر بصری اور صوتی اثرات کی وہ گہرائی پیش نہیں کر سکتیں، جو ڈرامے کی صورت میں ممکن ہو سکتی ہے۔ اگر بات اُردو ڈرامے کی ہو، تو یہ ناممکن ہے کہ آغا حشر کو یاد کیے بغیر گفتگو کو آگے بڑھایا جا سکے۔

غیر منقسم ہندوستان میں غدر کے ہنگامہ خیز دور میں امانت لکھنوی کے قلم سے لکھا گیا "اندر سبھا" ایک ایسا رجحان ساز ڈراما ثابت ہوا، جس سے ڈراما لکھنے کی تحریک از خود ایک تاریخ کو جنم دینے کی طرف مائل ہوگئی۔ حافظ عبداللہ، رونق بنارسی، ظریف، مرزا نظیر اور احسن لکھنوی وغیرہ وہ نام ہیں، جنہوں نے اُردو ڈرامے کو قدم بہ قدم آگے بڑھایا۔ یہاں تک کہ اُردو ڈراما "انارکلی" جیسے شاہ کار کو جنم دینے کے قابل ہوگیا۔ تاہم اس پورے دور میں ایک نام، جو آب و تاب کے ساتھ جگمگاتا نظر آتا ہے، آغا حشر کاشمیری کا ہے، جن کا اصل نام آغا محمد شاہ تھا۔ وہ 1879 میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد، آغا سید غنی شاہ ایک صاحبِ علم آدمی تھے اور تجارت سے وابستہ تھے۔ وہ 1869 میں اپنے بڑے بھائی کے ہمراہ بغرض تجارت سری نگر سے بنارس آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ حشر نے اُردو، عربی اور فارسی کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد انگریزی تعلیم کے حصول کے لئے بنارس کے راج نرائن ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔ اسی دوران شعرو شاعری سے شغف پیدا ہوا اور مقتضائے طبیعت کے تحت "حشر" تخلص اختیار کیا اور مشاعروں میں شرکت کرنے لگے۔ بمبئی (اب ممبئی) میں قیام کے دوران مذہبی مباحث میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ مولانا ابوالکلام آزاد، ابونصر آہ، سخا ہوشیار پوری اور مولانا ظفر علی خان کی صحبتوں نے مذہبی رنگ کو

نئے ڈھنگ سے آشنا کیا۔ دراصل یہی وہ صحبت تھی، جس کے تحت حشر کو خطابت کے فن سے آشنائی ہوئی، جس سے آگے چل کر انہوں نے اپنے ڈراموں میں بہت فائدہ اٹھایا۔ حشر کی ڈراما نویسی کی ابتدا 1901 میں بمبئی سے ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب ڈرامے کی دنیا میں احسنؔ اور بیتابؔ کا شہرہ تھا۔ ناٹک کمپنیاں اُن کے ڈراموں کے منہ مانگے دام دیا کرتی تھیں۔ ایسی فضا میں تعلیم یافتہ حشر نے حشر اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ تھیٹریکل کمپنیاں جو احسنؔ اور بیتابؔ کے ڈراموں کے لئے بے تاب رہا کرتی تھیں، اُس نوجوان ڈراما نویس کے ڈراموں کی اٹھان سے حیران رہ گئیں اور محسوس کرنے لگیں کہ اس نوجوان کے تحریر کردہ ڈراموں میں ضرور کوئی ایسی بات ہے جو لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ یوں دیکھتے ہی دیکھتے ہر تھیٹریکل کمپنی کو یہ خواہش ہونے لگی کہ حشرؔ اس کی کمپنی کے لئے ڈرامے تحریر کریں۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ حشرؔ جس تھیٹریکل کمپنی سے، جتنے وقت کے لئے بھی وابستہ ہوئے، اُس کمپنی کے دن پھر گئے۔

1901 سے شروع ہونے والے اس سفر کا سلسلہ 1932 تک جاری رہا۔ آغا حشر کی ڈراما نگاری لگ بھگ تین عشروں پر محیط رہی۔ اس پورے عرصے میں اُن کی شہرت کا آفتاب چمکتے چمکتے نصف النہار پر جا پہنچا۔ اس کا سبب آغا حشرؔ کی ذہانت اور مشاہدے کی قوت تھی۔ انہوں نے اپنے ڈراموں میں زمانے کے مزاج اور سماج کو سمو کر لوگوں کے دلوں پر راج کیا۔ حشرؔ نے اپنی طبیعت کی اُپج اور مکالموں کے پیچ و خم کے ساتھ ڈراما نگاری کے فن کو اتنی بلندی عطا کی کہ وہ اپنے دور کے ذوق اور مذاق کو بہتر بنانے کا مؤثر ذریعہ بن گیا۔ ڈرامے سے حشرؔ کی طبیعت کو فطری مناسبت تھی۔ اسٹیج کو انہوں نے ہر حیثیت سے پرکھا۔ پہلے پہل اداکار، پھر ڈراما نگار، پھر تھیٹر کمپنی کے مالک اور آخر میں فلمی ڈراما نگار۔ یوں یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ تھیٹر کے فن کو سب سے بہتر سمجھے تھے۔ انہوں نے اگرچہ اوّل و آخر عوام کو سامنے رکھتے ہوئے ڈرامے تحریر کئے، تاہم اُن کے ڈراموں کی قوت نے خواص کو بھی متاثر کیا اور یہی اُن کے انداز سخنوری کا اعجاز تھا۔ ''تاریخ ادب اُردو'' کے مصنف رام بابو سکسینہ کا کہنا ہے: ''آغا حشر کو لوگ ڈراما کا مارلو کہتے ہیں، کیونکہ اُن کے یہاں مارلو کا رنگ بہت گہرا ہے۔ وہ اپنے کریکٹروں میں وفور جذبات دکھاتے ہیں۔ اُن کا عشق بہت گہرا

اور جذبات بہت عمیق ہیں۔ وہ نظم ونثر دونوں کے استاد ہیں"۔ حشر کے ادبی ذوق اور شاعرانہ فکر کا درج بالا سطور میں کہیں اظہار کیا جا چکا ہے۔ اُن کی اس مہارت کا ثبوت اُن کے مشہور ڈرامے "ترکی حور" سے دیا جا سکتا ہے، جس میں وہ کردار کی زبان کو اشعار کا پیرہن عطا کرتے ہیں۔

ہاں ساقیِ میخانہ، بھر دے مرا پیمانہ
بدست گھٹا ہے، یا اڑتا ہوا میخانہ
ہوتی ہیں شبِ غم میں، یوں دل سے مری باتیں
جس طرح سے سمجھائے، دیوانے کو دیوانہ
کیا تم نے کہا دل سے، کیا دل نے کہا مجھ سے
بیٹھو تو سنا دوں میں، اک روز یہ افسانہ

حشر کے ڈراموں کو درج ذیل ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور 1901 سے 1905 پر محیط ہے۔ اس دور میں اُن کے مشہور ڈراموں میں مرید شک، مار آستین، میٹھی چھری اور اسیر ہوس وغیرہ شامل ہیں۔ اس دور کے زیادہ تر ڈرامے طبع زاد کے، بجائے ترجموں پر مشتمل ہیں اور زیادہ تر ترجمے انگریزی ادب کے لافانی ادیب شیکسپیئر کے ڈراموں پر مشتمل ہیں۔ یہی وہ دور تھا، جب اُنھیں "اُردو ڈراموں کا شیکسپیئر" کہا جانے لگا اور یہی اُن کی قبر کے کتبے پر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ تاہم، اُردو کے ممتاز ترین نقاد، پروفیسر احتشام حسین "آغا حشر کے ڈراما نگاری" میں تحریر کرتے ہیں: "آغا حشر کو اُردو کا شیکسپیئر کہا جاتا ہے لیکن یہ بات اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے، دونوں میں کوئی تعلق اور مناسبت نہیں ہے۔ ایک تخلیق کی غیر معمولی صلاحیت رکھتا ہے اور حیات انسانی کا حیرت خیز مصور اور مبصر اور عالم ہے تو دوسرا ڈراما نگاری کے بندھے ٹکے اصولوں پر چل کر عوام کی پسند اور تجارتی ماحول کا شکار ہو کر صرف فن کی سرحدوں کو چھو کر رہ جاتا ہے"۔

حشر کے ڈراموں کا دوسرا دور 1906 سے 1909 پر محیط ہے، جس میں شہید ناز، خوبصورت بلا، سفید خون اور صید ہوس شامل ہیں۔ تیسرا دور 1914 سے 1916 تک چلا ہے،

جس میں سلور کنگ، خواب ہستی، یہودی کی لڑکی، سورداس، بن دیوی، پہلا نقش زیادہ مشہور ہیں۔

حشر کے ڈراموں کا چوتھا دور 1917 سے 1924 کے عرصے پر محیط ہے۔ یہ اُن کے کلکتے (اب کول کتہ) کے قیام کا زمانہ ہے، جس میں انہوں نے ہندی ڈرامے زیادہ تحریر کئے۔ مدھر مرلی، بھاگیرتھ گنگا، بھارت منی (قدیم بن دیوی) ہندوستان (تین حصوں پر مشتمل ڈراما)، شروَن کمار، اسیر اور آنچ، ترکی حور، آنکھ کا نشہ، پہلا پیار، بھیشم وغیرہ یادگار ڈرامے ہیں۔ حشر کے ڈراموں کا آخری دور 1925 سے 1932 تک چلا ہے اور اس میں وہ اصلاحی ڈراموں کی طرف مائل نظر آتے ہیں۔ ستیا بن باس، رستم وسہراب، دھرمی بالک، دل کی پیاس اُسی دور کے ڈرامے ہیں۔

طنز و مزاح میں اکبر کا مقام

ہندوستانی ریاست اتر پردیش کا ضلع الہ آباد کئی حیثیتوں اور حوالوں سے جانا جاتا ہے۔ ہندوستان کا دوسرا سب سے قدیم شہر گنگا جمنا ملاپ کا حسین سنگم کہا جا سکتا ہے۔ مغل بادشاہ اکبر نے اسے الہ آباد کا نام دیا اور استداد زمانہ سے یہ الہ آباد کہا جانے لگا۔ اس علاقے کی ایک بڑی پہچان اردو کے ممتاز شاعر، اکبر الہ آبادی بھی ہیں۔ ان کا خاندان عرب سے ہجرت کر کے ایران اور ایران سے ہجرت کر کے ہندوستان آیا۔ اکبر کے ایک دادا کلکتہ (اب کول کتہ) میں روساء کے مقدمات کی پیروری میں مصروف رہا کرتے تھے، تاہم صدر دیوانی کے کلکتہ سے الہ آباد منتقل ہو جانے کے باعث وہ بھی الہ باد چلے آئے اور یوں اکبر کا خاندان الہ آباد ہی میں بس گیا۔ نومبر 1846ء میں سید مفضل حسین، جو عربی اور فارسی کے عالم تھے، کے گھر ایک بچہ پیدا ہوا، جس کا نام اکبر حسین رکھا گیا۔ اکبر کے بچپن کے دن بارہ، داؤد نگر اور سرام کے علاقوں میں بسر ہوئے۔ والد سے مقدور بھر کسب فیض حاصل کیا۔ اسی دوران اکبر کو پڑھنے سے بھی لگاؤ پیدا ہوا اور چند ایک کتابوں کے مطالعے کے بعد شہرۂ آفاق کتابیں "الف لیلیٰ" اور قصہ حاتم طائی پڑھ ڈالیں۔ اب طبیعت "ہل من مزید" کا تقاضا کرنے لگی اور اسی دوران الہ آباد کے مشن ہائی اسکول میں داخلہ بھی کرا دیا گیا۔ بمشکل تمام ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ غدر کا ہنگامہ ہوا اور تعلیم کا سلسلہ رُک گیا۔ غدر سے پیشتر حاصل ہونے والی آمدنی سے آسودہ حالی اور خوش حالی غدر کے بعد ایسی زبوں حالی میں تبدیل ہوئی کہ اکبر کو کم عمری ہی میں روزگار کی تلاش میں مصروف ہو جانا پڑا۔

چارلس کیننگ ایسٹ انڈیا کمپنی کا آخری گورنر جنرل تھا جس کا دورِ حکومت 58-1857 پر محیط رہا اور یہی وہ دور تھا جس میں برصغیر کے آنے والے دور کا تعین کر دیا گیا۔ اگرچہ غدر کا وقت اکبر کی صغیر سنی کا زمانہ تھا، تاہم اس دور کے واقعات نے ان کے دل و دماغ پر گہرے اثرات مرتب کیے،

جس کا واضح اظہار اکبر کے کلام میں جا بجا ملتا رہا۔ 1858 سے اکبر مختلف ملازمتوں سے منسلک ہو گئے۔ اوّلاً عدالتی ملازمتیں مقدر رہیں، جہاں اکبر کو قانونی معاملات کی نزاکتوں اور پیچیدگیوں سے کماحقہ واقفیت حاصل ہوئی۔ کم عمری ہی میں اکبر نے ازدواجی زندگی کا آغاز بھی کیا اور یہ 1859 کا زمانہ تھا۔ شادی اونچ نیچ کا شکار رہی اور اکبر نے دوسری شادی کر لی۔ دوسری بیوی جلد انتقال کر گئیں۔ تیسری شادی 1876 میں الٰہ آباد کی ایک خاتون سے کی۔ اگرچہ اس عرصے میں بھی اکبر کی ملازمتوں میں تسلسل کا فقدان انہیں پریشان کرتا رہا، تاہم ذہانت اور لیاقت نے اکبر کے وقفے وقفے سے جاری رہنے والی قانونی ملازمت کو مضبوط بنیادوں پر استوار کیا۔ وہ ہائی کورٹ کی وکالت کا امتحان پاس کر کے 1873 میں بطور وکیل الٰہ آباد، گورکھ پور اور آگرہ میں وکالت کرنے لگے۔ اس سے اگلی منزل عہدہ منصفی کی تھی، جو 1880 سے شروع ہو کر 1903 تک جاری رہی۔ جب وہ اس عہدے سے بطور جج ریٹائر ہوئے تو انہیں طویل عدالتی خدمات کے عوض سرکار کی طرف سے "خان بہادر" کا خطاب بھی دیا گیا۔ کم عمری ہی میں اکبر نے شعر گوئی کا سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا۔ وحید الدین وحید کے شاگرد رہے۔ اُس زمانے میں الٰہ آباد کی فضا شعر و ادب کے لئے انتہائی سازگار اور اکبر کے شعری ذوق کو مہمیز دینے کے لئے پوری طرح تیار تھی۔ ابتداء میں اکبر نے قدیم رنگ میں شاعری کی، تاہم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنا رنگ ایجاد کیا اور اُسے درجہ کمال تک پہنچا دیا۔ غزلوں میں قومی و سیاسی و سماجی زندگی کی عکاسی بہ انداز مزاح و طنز اکبر کا اعجازی اور اختصاصی میدان قرار پایا، جس میں کوئی اکبر ہمنوا نہ ہو سکا۔ ایسا نہیں کہ اردو شاعری میں طنز و مزاح کا رنگ اکبر سے شروع ہو، دکن سے اس سلسلے کا آغاز ہوا۔ کبھی واعظ، کبھی ناصح، کبھی شیخ اور کبھی زاہد کو طنز و مزاح کا نشانہ بنانا، اُس اوّلین دور سے ہی جاری تھا۔ ولی نے اپنے مخصوص انداز تغزل میں جب یہ کہا تھا

عجب نہیں جو کرے دل میں شیخ کے تاثیر
اگر مقدمۂ عشق کو کروں تحریر

تو گویا یہ شیخ پر طنز ہی کی ایک صورت تھی۔ یہ طنز و مزاح جو چھیڑ چھاڑ سے شروع ہوا، ہجو سے

ہوتا ہوا ہزل اور پھر ظرافت اور طنز کی دنیا تک آ پہنچا۔ انیسویں صدی کا نصف آخر تھا، جب لوگ اردو صحافت کے ذریعے اُس طنز و مزاح سے عام طور پر آشنا ہوئے۔ "مذاق"، "مدراس پنچ"، فرحت الاخبار" اور پھر "اودھ پنچ" نے تو اردو صحافت کی کایا ہی پلٹ کر رکھ دی۔ خود اکبر بھی "اودھ پنچ" کے لئے قلمی تعاون کیا کرتے تھے۔ طنز و ظرافت میں اکبر اپنی مثال آپ تھے۔ وہ اول مزاح نگار اور ثانیاً طنز نگار تھے۔ ندرت بیان اور لطف زبان اکبر کا خاصہ واثاثہ تھی۔ لکھنوی تہذیب کے قبول کئے ہوئے اثرات نے زبان کی چاشنی، فقرے بازی، رعایت لفظی اور الفاظ کی نشست و برخاست کے معاملے میں انہیں کمال درجہ مہارت دلا دی۔ اُن کے شعر نوک زباں ہوتے گئے۔

بتائیں آپ کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا
پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا

بوڑھوں کے ساتھ لوگ کہاں تک وفا کریں
لیکن نہ آئے موت تو بوڑھے بھی کیا کریں

نیٹو وہ ہے بنے جو یورپ میں
بات وہ ہے جو پائنیر میں چھپے

یہاں تک ہوا کہ اقبال جیسا نازش روزگار اور فلسفے کا شہسوار بھی اکبر کے رنگ شاعری سے متاثر ہوا اور جب طنزیہ و مزاحیہ رنگ اختیار کیا تو بے ساختہ اکبر ہی کی پیروری کی۔ "بانگ درا" میں اقبال کا اکبری رنگ صاف جھلکتا نظر آتا ہے۔

مشرق میں اصول دین بن جاتے ہیں
مغرب میں مشین بن جاتے ہیں

رہتا نہیں ایک بھی ہمارے پلے
واں ایک کے تین تین بن جاتے ہیں

جوشؔ ملیح آبادی کا پہلا مجموعہ "روحِ ادب" جب اشاعت کا لبادہ اوڑھ کر سامنے آیا تو اس پر اکبر کی رائے بھی درج تھی اور اکبر کے نام کے ساتھ "لسان العصر" کا سابقہ یہ گواہی دیتا تھا کہ اکبر کی شاعری کا سکہ چہار دانگ عالم میں چل رہا تھا۔ اکبر سے کچھ پیشتر ایک طرف سرسید احمد خان جیسی وسیع الخیال اور باکمال ہستی تھی، جو قوم کی ذہنی و تعلیمی پستی کو بلندیوں سے روشناس کرانا چاہتی تھی اور اس کے لئے انگریزی تعلیم کو ازبس ضروری جانتی تھی۔ مقصد حصول کی خاطر سرسید نے انگریزوں کی مخالفت کے بجائے حمایت کو دُرست جانا اور اس کی پاداش میں اپنوں اور غیروں کی مخالفت بھی مول لی۔ سرسید کے پہلو بہ پہلو حالیؔ، شبلیؔ، ڈپٹی نذیر احمد، محمد حسین آزاد بھی قوم و ملت کی زبوں حالی کو خوش حالی میں بدلنے میں مصروف تھے۔ اردو کے یہ "عناصرِ خمسہ" اپنی تحریری، تقریری اور تعمیری صلاحیتوں کی بنیاد پر اپنے اپنے حصے کا کام انجام دے رہے تھے۔ اُن ہی باکمال لوگوں میں اکبر الہٰ آبادی بھی تھے، جو مقصد یگانگت اور خیال کی وحدت کے ساتھ مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے ایک منزل کی طرف پہنچنا چاہتے تھے۔ اکبر نے تقلید مغرب کی حکمت کو درست نہ جانا اور اس بات کا بیڑا اُٹھایا کہ قوم کو ہلکے پھلکے انداز میں مغرب کے مُضر اثرات سے آگاہ کیا جائے۔ چنانچہ اکبر نے طنزیہ و مزاحیہ انداز اختیار کیا۔ ہندوستان میں تجارت کی غرض سے آنے والے انگریز اس سرزمین کے مالک بن بیٹھے تھے اکبر کا شمار اُن لوگوں میں ہوتا تھا، جو انگریزوں کی اس مداخلت بے جا کو کبھی بجا نہ سمجھتے۔

کچھ نہ پوچھ اے ہم نشیں، میرا نشیمن تھا کہاں
اب تو یہ کہنا بھی مشکل ہے، وہ گلشن تھا کہاں

کچھ اشجار میوہ دار ہیں اس باغ میں تو ہوں
مجھ کو نصیب کچھ بھی نہیں سیر کے سوا

جو کہا اُس نے، کیا منظور، کیا حرفِ نفی
ہم سراپا اب تو اس محفل میں "جی ہاں" ہو گئے

میں کیا کہوں احباب کیا کار نمایاں کر گئے
بی اے کیا نوکر ہوئے پنشن ملی اور مر گئے

ہم ایسی کل کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

چھوڑ لٹریچر کو اپنی ہسٹری کو بھول جا
شیخ و مسجد سے تعلق ترک کر اسکول جا

چار دن کی زندگی ہے کوفت سے کیا فائدہ
کھا ڈبل روٹی، کلرکی کر، خوشی سے پھول جا

حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا
پانی پینا پڑا ہے پائپ کا

اردو کے نامور نقادوں نے اکبر کی جدید تعلیم سے بیزاری اور سائنسی ایجادات کی مخالفت کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھا۔ ممتاز نقاد، پروفیسر آل احمد سرور کا شمار بھی ایسے ہی افراد میں ہوتا ہے۔ "تنقید کیا ہے؟" میں وہ اکبر کے ذیل میں گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"اُن کے ہاں صرف روایت پرستی نہیں رسم پرستی بھی ہے۔ وہ نل کے پانی، ترقی، تعلیم، ٹائپ کے حروف، عورتوں کی تعلیم، سیاسی جدوجہد، سائنس، عقلیت اور فطرت پر تسخیر کا بھی مذاق اُڑاتے ہیں۔ نئی تہذیب اپنے ساتھ جو برکتیں لائی، اکبر نے ان پر نظر نہیں کی ۔سرسید کی تحریک کے ذریعے جو تعلیمی و تہذیبی، علمی و ادبی قدریں ہمیں ملیں، اکبر اُن سے خوش نہیں تھے، تاہم اصلاح قوم ہمیشہ اکبر کے پیش نظر رہی اور وہ سرسید کے مانند اپنے مخالفین سے بے نیاز اپنا کام کرتے رہے۔ ہلکے پھلکے انداز میں کبھی صرف مزاح اور کبھی طنز کے ہتھیار سے کام لیتے۔"

نہ کرو صاحب نسب نامے وہ وقت آیا ہے اب
بے اثر ہوگی شرافت، مال دیکھا جائے گا

اس قدر تھا کھٹملوں کا چار پائی میں ہجوم
وصل کا دل سے مرے ارمان رخصت ہوگیا

اُس کی بیٹی نے اُٹھا رکھی ہے دنیا سر پہ
خیریت گزری کہ انگور کے بیٹا نہ ہوا

دعویٰ بڑا ہے علم ریاضی میں آپ کو
طول شب فراق ذرا ناپ دیجئے

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا

پوچھا جو اُن سے، آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

اردو کے علاوہ فارسی، عربی، انگریزی اور ریاضی میں اکبر نے خاطر خواہ استعداد حاصل کی۔ افلاطون، کانٹ، ہیگل، برگساں، برکلے، مل، اسپنسر جیسے مصنفین مطالعے کا موضوع رہے۔ "فیوچر آف اسلام" جسے ولفرڈ اسکان بلنٹ نے تصنیف کیا تھا، کا اکبر نے ترجمہ بھی کیا۔

9 ستمبر 1921 کو الٰہ آباد میں شاعری کا یہ ستارہ اپنی تابناکیوں سے ایک دنیا کو منور کر کے ہمیشہ کے لئے ڈوب گیا۔

ان مصائب میں بھی مایوس نہیں ہوں، اکبر
قید ہستی سے رہائی کی خوشی باقی ہے

الطاف حسین حالیؔ کی ادبی خدمات

جوشؔ ملیح آبادی نے اپنی نظم "نقاد" کا آغاز کچھ اس طرح کیا ہے۔

رحم اے نقادِ فن یہ کیا ستم کرتا ہے تو
کوئی نوکِ خار سے چھوتا ہے نبضِ رنگ و بو

شاعری اور منطقی بحثیں یہ کیسا قتلِ عام
برشِ مقراض سے دیتا ہے زلفوں کو پیام

پوری نظم جوشؔ کے مخصوص لب و لہجے اور آہنگ کی آئینہ دار ہے، جس میں نقاد پر نقد و جرح کی گئی ہے۔ تاہم نظم کے حُسن و قبح سے صرفِ نظر کرتے ہوئے مجرد یہ بات کہ تخلیق ہو اور تنقید نہ ہو، کسی فن پارے پر گفتگو محض توصیف و تحسین ہی پر مبنی ہو، درست قرار دی جاسکتی ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کی حمایت میں کوئی نکتہ تلاش کرنا کسی بھی عنوان سے نکتہ رسی کے دائرے میں نہیں آئے گا۔ گویا یہ بحث کہ تنقید کسی تخلیق کو رد کرتی ہے، شاید صحیح نہ قرار دی جاسکے۔ اگر کسی فن پارے پر گفتگو کی جارہی ہے، اگر کسی صنف کو موضوعِ سخن بنایا جارہا ہے اور اگر کسی شعری یا نثری تخلیق کو اظہار کا مقصد قرار دیا جارہا ہے، تو اس کا بدیہی مطلب یہی برآمد ہوتا ہے کہ تنقید تخلیق کو جھٹلانے کے بجائے اپنانے کی طرف مائل نظر آتی ہے۔ جب اُردو ادب میں تنقید کی بات کی جائے تو بلا مبالغہ "اُردو کے عناصرِ خمسہ" میں سے ایک خواجہ الطاف حسین حالیؔ کو اُردو تنقید کا بانی قرار دیا جاسکتا ہے۔ اگرچہ ایسا نہیں ہے کہ حالیؔ سے پیشتر اُردو میں تنقید کا چلن نہیں تھا، یا یہ موضوع سرے ہی سے موضوعِ سخن نہیں تھا۔ اگر تخلیق تھی، ادب تھا، شعر و شاعری تھی تو اُس پر نظر رکھنے والے، اُس کو پسندیدگی یا ناپسندیدگی کی سند دینے

والے، اُس پر گفتگو کرنے والے، اُس میں کوئی نیا نکتہ پیدا کرنے والے، کوئی نیا گوشہ دریافت کرنے والے گویا تخلیق کو بہتر بنانے کی کسی "کوششِ بے نظام" ہی میں مصروف تھے۔ اور یہ کوشش دراصل تنقید کی غیر واضح شکل کہی جا سکتی ہے۔ اگر سوداؔ کی کہی گئی ہجو میں کسی شاعر یا شعر پر پھبتی کسی گئی تھی تو گویا وہ تنقید ہی کی ایک شکل تھی۔ تاہم انتقادیات کی یہ غیر واضح شکل اخلاقیات کی کوئی متعین حد نہیں رکھتی تھی۔ اگر میر تقی میرؔ اپنی کتاب "نکات الشعراء" میں شعراء کے تذکرے کے بیان میں کسی شعر کو سراہتے یا اُسے رد کرنے کی بات کرتے تھے تو یہ گفتگو بھی تنقید ہی کی ایک صورت قرار دی جا سکتی تھی۔ اگر مرزا غالبؔ نے ایک شعر میں میرؔ کی بابت اس رائے کا اظہار کیا۔

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخؔ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں

تو گویا غالبؔ شاعری کے مسلم الثبوت استاد شیخ امام بخش ناسخؔ کی "تنقیدی بصیرت" کے دل سے قائل تھے، جو میرؔ کی شعری صلاحیتوں کے معتقد تھے اور ناسخؔ جیسے اصلاح زبان کی زبان سے کسی شاعر کے لیے توصیفی کلمات تنقیدی خیالات کی اگلی منزل قرار دیے جا سکتے ہیں۔

اگر میر انیسؔ کا اپنے مرثیے میں شعر کی خوبی بیان کرتے ہوئے یہ مصرعہ کہنا

لفظ مغلق نہ ہو گنجلک نہ ہو تعقید نہ ہو

تو یہ بھی کلام کو دوام دینے کا ایک تنقیدی اصول بیان کیا جا رہا تھا۔ گویا شاعر کے اندر یا اُس کے باطن میں موجود تنقیدی شعور اُس کو خود اپنے کلام کے ردّ و قبول کا کوئی پیمانہ متعین کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ اُس پیمانے کو اپنانے کے لیے وہ کسی اُسلوب کو اختیار کرتا ہے اور اُسی کے تابع رہ کر سخن کرنا اُس کو اقلیم سخنوری میں کسی مقام کا حامل قرار دلواتا ہے۔ تاہم یہ بات بالیقین کہی جا سکتی ہے کہ حالیؔ نے اُردو ادب میں تنقید کے اُصول و ضوابط کو ایک متعین شکل دی۔ حالیؔ کی "مقدمہ شعر و شاعری" کو اُردو کی پہلی باقاعدہ تنقیدی تصنیف قرار دیا جا سکتا ہے، جس نے صحیح معنوں میں شعر کے پیرایہ اظہار کے مختلف زاویوں کو گہرائی میں اتر کر دیکھا اور اُس سے کچھ نتائج اخذ کیے۔

189 میں شائع ہونے والی قدیم غزلوں اور جدید نظموں پر مبنی اپنے مجموعے کو حالی نے ایک طویل اور منضبط اور مبسوط مقدمے کے ساتھ اہلِ ادب کے سامنے پیش کیا، جس نے شائع ہوتے ہی عوام وخواص سے داد سمیٹی۔ حالی کا ''مقدمہ شعروشاعری'' دراصل نظامِ شعری کا ایک ایسا قابلِ تقلید دستورالعمل قرار پا گیا، جس سے روگردانی شاید آج بھی ممکن نہیں۔ حالی نے ''مقدمہ شعر وشاعری'' میں ادب کو وسیع تناظر میں دیکھا۔ اُن کی عالمانہ نظر میں شعروادب کی ایک دنیا آباد تھی۔ ایشیا کا ادب، اُس کی تاریخ کے نشیب و فراز، موڑ، ارتقائی امور، سماجی رجحانات، شعروشاعری کی بنیادی غرض وغایت اور ان سب کے بیان میں حالی کا معروضی انداز اور میانہ روی مقدمے کو پُر اثر بنانے میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔ جس دور میں حالی نے ''مقدمہ شعروشاعری'' تحریر کیا تو وہ 'ادب برائے اصلاح'' کے مقصد پر گامزن تھے۔ غدر کے اثرات موجود تھے۔ ہندوستان کا قدیم تہذیبی نظام آخری سانسیں لے رہا تھا۔ لاہور میں جدید طرز کے مشاعرے ذہن کو بیدار کر رہے تھے۔ غزل جدید غزل کا پیرہن اختیار کر چکی تھی۔ گویا کیفیت کچھ یہ ہو چکی تھی۔

اب گئے حالی غزل خوانی کے دن
راگنی بے وقت کی گاتے ہو کیا

سرسید عملی طور پر قوم کی اصلاحِ احوال کے لیے پیرانہ سالی میں سرگرمِ عمل تھے۔ ایسے میں حالی نے بھی پیروی سرسید میں اصلاحی فکر کو رواج دیا اور ''مقدمہ شعروشاعری'' میں غزل پر بھرپور توجہ محض اسی لیے مرکوز کی کہ وہ اُس صنف کو مقصدیت پر مبنی ایسی صنف بنانا چاہتے تھے، جس سے قوم کی زبوں حالی کو خوش حالی میں تبدیل کیا جا سکے۔ گویا حالی اگر یہ شعر کہتے ہیں۔

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب دیکھیے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں

تو درحقیقت وہ یہ تنقیدی اصول بیان کر رہے ہیں کہ شعرگوئی ایک ایسی سخت مشقت ہے کہ

اس میں شاعر ایک ایسا معیار متعین کر لیتا ہے کہ اگر شعر اس معیار سے کم تر درجے کا ہو تو اُسے رد کر دیا جائے۔ یعنی جستجو یہی ہے کہ بہتر سے بہتر کلام کہا جائے، بات کی جائے، نکتہ دیا جائے، خیال پیش کیا جائے اور ان تمام باتوں کے لیے صاحب نظر ہونا ضروری ہے۔ حالی کی بیان کی گئی شرائط کے مطابق اچھے شاعر کے پاس تین بنیادی صلاحیتوں کا ہونا ناگزیر ہے۔ یہ تین صلاحیتیں تخیل، کائنات کا مطالعہ اور تفحص الفاظ کا ہونا ہے۔ اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ پہلی صلاحیت وہبی یعنی من جانب اللہ ہے اور باقی دو صفات کسبی یعنی اکتساب کردہ ہیں۔ اسی کے پہلو بہ پہلو وہ سادگی، اصلیت اور جوش کو بھی شعر کا لازمہ جانتے ہیں اور جسے انہوں نے برطانوی شاعر، جان ملٹن سے مستعار لیا ہے۔ حالی کی تنقیدی صلاحیتوں کے بارے میں ممتاز نقاد کلیم الدین احمد اس رائے کا اظہار کرتے ہیں:

> ''اُردو میں نئی تنقید کی ابتدا حالی سے ہوتی ہے۔ اُردو تنقید کی دنیا محذوف و مقصور کے جھگڑوں، زبان و محاورات کی صحت، اساتذہ کی ہنگامہ آرائی تک محدود تھی۔ حالی نے سب سے پہلے جزئیات سے قطع نظر کر کے بنیادی اصولوں پر غور و فکر کی، شعر و شاعری کی بصیرت پر کچھ روشنی ڈالی اور مغربی خیالات سے کچھ استفادہ کیا۔ اپنے زمانے، اپنے ماحول، اپنے حدود میں حالی نے جو کچھ کیا وہ لائق ستائش ہے۔ حالی صرف اُردو تنقید کے بانی ہی نہیں، اس وقت تک اُردو کے بہترین نقاد بھی ہیں۔''

گویا بحث کو سمیٹتے ہوئے یہ رائے قائم کی جا سکتی ہے کہ اگر آج تنقید کے مختلف دبستان وجود میں آئے ہیں تو یہ حالی کے تنقیدی وجدان ہی کا کافی حد تک نتیجہ ہیں اور اس بات کے لیے اُردو ادب اور خاص طور پر اُردو تنقید کو حالی کا شکر گزار ہونا چاہیے۔

☆☆☆☆☆
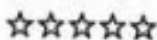
ابن صفی: جاسوسی ادب کا لازوال کردار

برصغیر کے نامور مزاح نگار، شوکت تھانوی نے اسی سرزمین کی بے مثل مغنیہ، لتا منگیشکر کو ایک خط میں تحریر کیا کہ آپ کی مدھر آواز کے ذریعے اُردو زبان دنیا بھر میں گھمبی جارہی ہے اور آپ اُردو کی بہترین خدمت انجام دے رہی ہیں۔ کچھ یہی بات اُردو کے مقبول ترین جاسوسی ناول نگار، ابنِ صفی پر بھی صادق آتی ہے۔ وہ ابنِ صفی، جن کی تحریریں سرحدوں سے ماورا ہو چکی ہیں، اگر چہ اُن کے کردار ماورائی نہیں، بلکہ انسانی ہیں۔ یوں تو جاسوسی ناول نگاری کو ادب میں سنجیدہ صنف کا درجہ دینے میں لیت ولعل سے کام لیا جاتا رہا، تاہم اس بات میں ہرگز کلام نہیں کہ جاسوسی ناول نگاری ادب کی "مقبول صنفِ سخن" رہی۔ ناقدینِ ادب "مقبول ادب" کو معیاری قرار دینے سے بھی گریزاں رہے، تاہم جب بھی کسی مضبوط علمی وادبی شخصیت نے "مقبول ادب" تحریر کیا تو اُسے "معیاری ادب" بنا کر پیش کیا، جس کی سب سے بڑی مثال ابنِ صفی ہیں۔ ابنِ صفی 1928 میں قصبہ نارہ، ضلع الٰہ آباد، یوپی میں پیدا ہوئے۔ نام اسرار احمد تجویز کیا گیا اور اس نام سے ایسی ازلی مناسبت حاصل ہوئی کہ زندگی بھر کسبِ معاش کے لئے "اسرار و رموز سے پُر جاسوسی ناول" تحریر کرتے رہے، اگر چہ قلمی نام ابنِ صفی اختیار کیا اور اس نام نے بھی اتنی مقبولیت حاصل کی کہ کتنے ہی قلم کار اپنے نام کے سابقے اور لاحقے میں "ابن" یا "صفی" استعمال کرنے لگے۔ ابنِ صفی کے ماموں نوح ناروی کا شمار اساتذۂ سخن میں کیا جاتا تھا، جو داغ دہلوی کے شاگرد تھے۔ "طوفانِ نوح"، "سفینۂ نوح" اُن کے مشہور مجموعۂ کلام ہیں۔

وہ نادم ہوئے قتل کرنے کے بعد
ملی زندگی مجھ کو مرنے کے بعد

ایسے پس منظر کے ساتھ ابنِ صفی کو ادبی میدان کا رُخ کرنا ہی تھا۔ ابتدائی تعلیم اپنے آبائی قصبے میں حاصل کی۔ اُردو کی کلاسیکی کہانی "طلسم ہوشربا" نو عمری میں ختم کر لی۔ اس ہوشربا داستان کا اتنا اثر ہوا کہ اسے سات مرتبہ پڑھا۔ اس کے علاوہ بھی اُردو ادب کا مطالعہ جاری رکھا۔ ساتویں جماعت میں تھے تو اُردو کی پہلی کہانی تحریر کی، جس کا عنوان "ناکام آرزو" تھا۔ یہ کہانی اُس زمانے کے مشہور ناول نگار، عادل رشید کے ہفت روزہ رسالے "شاہد" میں شائع ہوئی، جو بمبئی (اب ممبئی) سے نکلتا تھا۔ ابنِ صفی نے یہ کہانی اسرار ناروی کے نام سے لکھی تھی۔ عادل رشید نے اسرار ناروی کو ایک بڑی عمر کا قلم کار گمان کرتے ہوئے، اُس زمانے کے رواج کے عین مطابق اُن کے نام کے ساتھ "نتیجۂ فکر مصورِ جذبات حضرت اسرار ناروی" تحریر کیا۔ دراصل یہی ابنِ صفی کے قلمی سفر کا آغاز تھا۔ اُدھر شاعری کی حسین دیوی بھی ابنِ صفی کو اپنی زلفوں کے دام میں لینے کو بے چین تھی۔ ابنِ صفی نے اُسے بھی مایوس نہیں کیا اور شعر کہنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ شاعری میں وہ جگر مرادآبادی سے بے حد متاثر تھے۔ میٹرک کا امتحان الٰہ آباد سے پاس کیا۔ اسی دوران وہ کمیونسٹوں کے نزدیک آ گئے، جس کے زیرِ اثر سماجی برائیوں کے خلاف نظمیں بھی تحریر کیں۔ تاہم جلد ہی اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ شاید اسی کا نتیجہ تھا کہ تقسیمِ ہند کے موقع پر اُن کے باغیانہ خیالات کے باعث اُن کے وارنٹ جاری کیے گئے۔ "ایونگ کرسچین کالج" الٰہ آباد سے انٹرمیڈیٹ کی تعلیم پائی۔ یہاں کا مخلوط نظامِ تعلیم اُن کی شاعرانہ صلاحیتوں کو جلا بخشنے لگا۔ کالج کی شعری نشستوں میں پیہم شرکت ہونے لگی۔ انٹر کے دوسرے سال کالج کی لٹریری سوسائٹی کے صدر منتخب ہوئے۔ اسی حیثیت میں ایک نظم "بانسری کی آواز" پڑھی، جو بے حد پسند کی گئی۔ اُردو فیکلٹی کے ڈین، مولانا انوار الحق نے پیش گوئی کی کہ یہ لڑکا مستقبل کا عظیم شاعر بنے گا۔ کالج کے انگریزی کے پروفیسر مسز ہنگس نے، جو اردو شاعری کے دلدادہ اور فراق کی رُباعیات کے عاشق تھے، ابنِ صفی کی اس نظم کو دل کھول کر سراہا۔ 1947 میں گریجویشن کے لئے الٰہ آباد یونی ورسٹی میں داخلہ لیا۔ وہاں کا آزاد اور علمی ماحول اور اُس پر ڈاکٹر سید اعجاز حسین کے پُر مغز لیکچرز، ابنِ صفی کے ذہنی اُفق کو نئی تابانیوں سے روشناس کرا رہے تھے۔ یہ وہی اعجاز حسین تھے جن کی کتاب "نئے ادبی رجحانات" کا پہلا ایڈیشن 1942

میں شائع ہونے کے محض چھ ماہ کے اندر ختم ہو گیا۔ تاہم یہ سلسلہ زیادہ وقت جاری نہ رہ سکا۔ تقسیم اپنا اثر دکھا رہی تھی۔ برصغیر میں ہنگاموں اور شورش کی یورش تھی۔ ایسا ہی ایک واقعہ یونی ورسٹی کی حدود میں بھی پیش آیا، جس کے باعث تعلیم کا سلسلہ ترک کرنا پڑا۔ تقسیم کے بعد 1948 میں تعلیم کا ترک کیا ہوا سلسلہ دوبارہ شروع کیا، تاہم اس مرتبہ الہ آباد کے بجائے، آگرہ یونی ورسٹی سے بی۔ اے کی تکمیل ہوئی۔ الہ آباد کے قیام میں ابنِ صفی نے اچھے دوست بنائے، جن میں علی عباس حسینی (ادارہ نکہت الہ آباد)، شکیل جمالی، مصطفیٰ زیدی (تب تیغ الہ آبادی تخلص کرتے تھے)، نازش پرتاب گڑھی وغیرہ شامل ہیں۔ علی عباس حسینی کے ساتھ مل کر ابنِ صفی ایک رسالے کے شعری گوشے کے مدیر بنے۔ یہاں اُنہوں نے ادب کی مختلف اصناف میں اپنا ہنر استعمال کیا اور طغرل فرغان کے قلمی نام سے لکھنا شروع کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب اُردو ادب میں غیر اخلاقی تحریریں جگہ بنا چکی تھیں۔ ایک نشست میں جب یہ بات سامنے آئی تو ابنِ صفی نے اپنے آپ سے یہ عہد کیا کہ وہ اس رجحان کو بدل کر رہیں گے۔ یہ پچاس کا ابتدائی زمانہ تھا۔ ابنِ صفی نے پہلی مرتبہ "جاسوسی دنیا" کے نام سے ایک ناول "دلیر مجرم" تحریر کیا، جس کے مرکزی کردار انسپکٹر فریدی اور سارجنٹ حمید تھے۔ مارچ 1952 میں شائع ہونے والے اس پہلے ناول کا پلاٹ وکٹر گنز کے ناول سے ماخوذ تھا۔ اس دوران میں وہ اسلامیہ ہائی اسکول، الہ آباد میں سیکنڈری اسکول ٹیچر کے طور پر خدمات بھی انجام دیتے رہے۔ اگست 1952 میں ابنِ صفی پاکستان آگئے۔ یہاں اُنہوں نے اسرار پبلی کیشنز کے نام سے ادارہ قائم کیا، جس کے تحت جاسوسی ناول پاکستان اور ہندوستان سے بیک وقت شائع ہونے لگے۔ اگست 1955 میں "عمران سیریز" کے نام سے ایک نیا سلسلہ شروع کیا گیا اور اس کا پہلا ناول "خوفناک عمارت" تھا۔ ان دونوں سلسلوں کو پڑھنے والوں میں بے نظیر مقبولیت حاصل ہوئی اور لوگ ہر ماہ ان ناولوں کے منتظر رہنے لگے۔ فریدی کی سنجیدہ، مضبوط اور خوب صورت شخصیت اور عمران کی بظاہر احمق اور بباطن چالاک نظر آنے والی شخصیت کو ابنِ صفی پوری چابکدستی اور کمال مہارت کے ساتھ اپنے قارئین کے سامنے پیش کرتے رہے اور لوگ دیوانہ وار اُن کرداروں کو ناولوں میں چلتا پھرتا دیکھتے اور پیار کرتے رہے۔ 1960 سے 1963 کے دوران ابنِ صفی شیزو

فیر ینیا کے مرض میں مبتلا رہے اور ایک لفظ بھی نہ لکھ سکے۔ یہی وہ زمانہ تھا، جب ڈھیروں ایسے ناول نگار سامنے آئے، جن کے نام میں کہیں نہ کہیں "ابن" یا "صفی" موجود تھا۔ صحت یابی کے بعد جو ناول منظر عام پر آیا، وہ "عمران سیریز" کا "ڈیڑھ متوالے" تھا۔ جس کا بھارت میں افتتاح لال بہادر شاستری (سابق وزیر اعظم ہندوستان) نے "نکہت" کے دفتر الہ آباد آ کر کیا۔ یہ ناول بھارت میں اس قدر مقبول ہوا کہ ایک ہفتے ہی میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کرنا پڑا۔ ستر کے وسط عشرے میں ابن صفی آئی ایس آئی کے نئے افسران کو جاسوسی کے طور طریقوں پر لیکچرز بھی دیا کرتے۔ جب 26 جولائی 1980 کو ابن صفی کا انتقال ہوا تو وہ اپنے پیچھے 245 ایسے جاسوسی ناول چھوڑ گئے، جو اُن کی زندگی اور بعد از زندگی بھی پڑھے جاتے رہے۔ اُن کے قارئین میں نامور ادیب، شاعر، سیاست دان وغیرہ شامل تھے۔ ابن صفی جب مجنوں گورکھپوری سے ملاقات کے لئے پہنچے تو انہوں نے کہا کہ تم اپنے ناولوں میں "تشویش کن" کا لفظ غلط استعمال کرتے ہو۔ ابن صفی نے جواب دیا کہ آپ جیسا عالم میرے ناول پڑھتا ہے، یہی میرا سب سے بڑا اعزاز ہے۔ شیخ مجیب الرحمان کی والدہ آخر دم تک اور بنگلہ دیش کے قیام کے بعد تک ابن صفی کے ناولوں کی شیدائی رہیں۔ نامور نقاد، شمس الرحمان فاروقی نے ابن صفی کے چند ناولوں کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا۔ اُردو کے اس بے مثل جاسوسی ناول نگار نے میدان شعر و سخن میں بھی نام کمایا۔

بالآخر تھک ہار کے یارو، ہم نے یہ تسلیم کیا
اپنی ذات سے عشق ہے سچا، باقی سب افسانے ہیں

جو کہہ گئے، وہی ٹھہرا ہمارا فن اسرار
جو کہہ نہ پائے، نہ جانے وہ بات کیا ہوتی

شاعرِ حُسن پرور: اخترؔ شیرانی

اردو شاعری کا کیٹس بھی کہا جاتا ہے

''ٹونک'' راجستھان (بھارت) کا نام ذہن میں آتے ہی، اُردو ادب کے نامور محقق، حافظ محمود شیرانی، ''پنجاب میں اُردو'' جیسے بڑے کام کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ اُن کے اس تحقیقی کام کی، اگرچہ بہت پذیرائی ہوئی، تاہم بعد کے محققین، جن میں ڈاکٹر شوکت سبزواری اور دیگر نامور لوگ شامل تھے، اُن کے قائم کئے گئے استدلال کو قبول کرنے میں پس وپیش کرتے رہے۔ حافظ صاحب نے تحقیق میں نام کمایا اور چاردانگِ عالم اپنا سکہ جمایا۔ اُن ہی حافظ صاحب کے گھر 4 مئی 1905 کو ایک بچے نے جنم لیا۔ باپ نے نام محمد داؤد خان تجویز کیا۔ اب بچے کی تعلیم وتربیت کا دور شروع ہوا۔ داؤد خان نے 1921 میں منشی فاضل اور اگلے برس ادیب فاضل کا امتحان پاس کیا۔ اگرچہ باپ کی خواہش تھی کہ بیٹا مزید تعلیم حاصل کرے، مگر وہ شاعری کی الہڑ دوشیزہ کو دل دے بیٹھا۔ جب باپ نے دیکھا کہ اب کچھ نہیں ہوسکتا تو شعر گوئی میں طاق بنانے کے لئے علامہ تاجورؔ نجیب آبادی کی تربیت میں دے دیا۔ یہ ملاپ گویا شاعری کے لئے ''نجیب الطرفین'' ثابت ہوا۔ تاجورؔ اپنی آزاد طبیعت کے تحت قافیے کی بندش سے رنجش محسوس کرتے تھے اور یہی کچھ وہ اگلی نسل میں بھی منتقل کرنا چاہتے تھے۔ داؤد نے سب سے پہلے اپنے نام سے پیچھا چھڑایا اور ''اختر شیرانی'' کے شاعرانہ نام سے کلام کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ یہ کلام کبھی کبھی خود کلامی کی کیفیت سے بھی دوچار رہنے لگا۔ اختر شیرانی چلتے چلتے ایک اور ہی دنیا میں جا پہنچے۔ وہ دنیا جہاں اُن کے لئے خارجی معاملات، کارِ عبث کی حیثیت اختیار کر گئے۔ اب وہ اپنی داخلی دنیا کے اسیر تھے۔ یہ وہ دنیا تھی، جو اختر شیرانی کے لئے وجود زن سے موجزن تھی، یہ وہ زندگی تھی، جس کو

اختر حسن، عشق اور شباب و شراب کے ساتھ بسر کرنا چاہتے تھے۔

موسم بھی ہے، عمر بھی، شباب بھی ہے
پہلو میں وہ رشکِ ماہتاب بھی ہے
دنیا میں اب اور چاہیے کیا مجھ کو
ساقی بھی ہے، ساز بھی، شراب بھی ہے

1923 سے 1939 تک اختر شیرانی ادبی جرائد انتخاب، بہارستان، خیالستان اور رومان کے مدیر کے طور پر بھی کام کرتے رہے۔ یہاں رہتے ہوئے اختر شیرانی نے بحیثیت مدیر کئی نئے لکھنے والوں کو متعارف کرایا، جن میں ایک نام، جو بعد میں شہرت اور ناموری کے کئی ہفت خواں طے کر گیا، قدرت اللہ شہاب بھی تھا۔ "چندراوتی" کے نام سے قدرت اللہ شہاب کا پہلا افسانہ، اختر شیرانی کے "رومان" ہی میں شائع ہوا تھا۔ اختر شیرانی نے نثر میں افسانوں اور تراجم کے علاوہ ادبی اور تنقیدی مضامین بھی تحریر کیے۔ جب طبیعت کی بے قراری کسی اور جادۂ فکر کی طلب گاری سے دوچار ہوئی تو یہ شاعرِ رومان، مولانا محمد علی جوہر کے "ہمدرد" اور مولانا ظفر علی خان کے "زمیندار" میں کالم لکھنے پر مامور ہوا۔

اگرچہ اختر نے قدیم سے گزر کر جدید دور میں قدم رکھا تھا، لہٰذا قدیم کی پاسداری کے ساتھ، جدید کی طلب گاری اختر کے یہاں شدت سے در آئی تھی۔ یہ وہی جدت تھی، جس کی شدت نے اختر کو قدیم شاعروں کے یہاں محبوب کے محض ذکر تک محدود نہیں رکھا بلکہ لوگوں کو محبوب کے نام سے بھی روشناس کرایا اور وہ اختر کی شاعری میں اختر کے محبوب کو اُن سے کلام کرتا دیکھنے لگے۔

سنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں
یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی ہے
پری و حور کی تصویر نازنیں عذرا

اختر دنیاومافیہا سے بے خبر اپنے محبوب کی ادائے دلبرانہ کو لہجۂ شاعرانہ میں بیان کرتے ہیں۔

تمہیں ستاروں نے، بے اختیار دیکھا ہے
شریر چاند نے بھی، بار بار دیکھا ہے
رو پہلی چاندنی نے رات کو کھلی چھت پر
ادا سے سوتے ہوئے بار بار دیکھا ہے

اختر عمل کے نہیں، خیال کے آدمی بن کر رہ گئے۔ انہوں نے اپنی دنیا، تخیل سے تعمیر کی۔ ایسی دنیا، جو بہاروں بھری اور تاروں بھری تھی، جہاں چہار سُو محبت کی نکہت تھی، جہاں کلفت کی بے سروسامانی اور راحت کی ارزانی طبیعت کو ہر پل شادمانی عطا کرتی تھی۔

محبت کے لئے آیا ہوں میں دنیا کی محفل میں
محبت خون بن کر لہلہاتی ہے مرے دل (۱) میں
محبت ابتدا میری، محبت انتہا میری
محبت سے عبارت ہے بقا میری، فنا میری

اُردو شاعری کو بے باکی، والہانہ پن اور موسیقیت عطا کرنے والے اختر، اردو شاعری کے کیٹس کہلائے جانے لگے۔

کتابِ عاشقی کے جب اُلٹتے تھے ورق ہم تم
وہ راتیں، جن میں بے خوابی کے لیتے تھے سبق ہم تم
فقط اتنا بتا دو کیا وہ باتیں پھر نہ آئیں گی
وہ راتیں، آہ وہ راتیں، وہ راتیں پھر نہ آئیں گی

ایک سرخوشی، خود فراموشی اور مستانہ کیفیت کے ساتھ اختر خود اپنے آپ کو دنیا کی رنجشوں اور کلفتوں سے دُور چلنے کو کہہ رہے ہیں۔

اے عشق کہیں لے چل اس پاپ کی بستی سے
نفرت گہہ عالم سے، لعنت گہہ ہستی سے
اُن نفس پرستوں سے اس نفس پرستی سے
دُور اور کہیں لے چل! اے عشق کہیں لے چل!

غمِ جاناں کی آرزو اور جستجو کے لئے اختر سب کچھ تج دینے کو تیار ہیں۔

میں آرزوئے جاں لکھوں یا جانِ آرزو
تُو ہی بتا دے ناز سے ایمانِ آرزو
آنسو نکل رہے ہیں، تصور میں بن کے پھول
شاداب ہو رہا ہے، گلستانِ آرزو

کبھی کبھی جب کوئی بھولا بھٹکا جنم بھومی سے آتا تو وہ سراپا اور مجسم سوال بن کر پوچھتے۔

او دیس سے آنے والے بتا!
کس حال میں ہیں یارانِ وطن
آوارۂ غربت کو بھی سنا
کس رنگ میں ہیں کنعانِ وطن

عشق پیشہ اور آزادی پسند اختر نے جب ان دونوں کیفیتوں کا موازنہ کیا تو بے اختیار گویا ہوئے۔

عشق و آزادی بہارِ زیست کا سامان ہے
عشق میری جان، آزادی مرا ایمان ہے
عشق پر کر دوں فدا میں اپنی ساری زندگی
لیکن آزادی پہ میرا عشق بھی قربان ہے

کشاکشِ زیست نے اختر شیرانی کو چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ پے در پے حوادث کا سلسلہ کچھ یوں رہا کہ بقول امیر مینائی

جب اترتی ہیں فلک سے تو یہیں آتی ہیں
تاک رکھا ہے بلاؤں نے ہمارے گھر کو

جوان بیٹے (زبور) کی موت ہی ایک صدمۂ جانکاہ تھا کہ داماد کی دریا میں ڈوب کر ہونے والی موت نے بھی ہلا کر رکھ دیا۔ قریبی دوست (شجاع خان شیون) کی موت نے سُونی زندگی میں بے سکونی کے لمحات اور طویل کر دیے اور اس پر مستزاد سلمیٰ کی جدائی۔ گویا اختر کے لئے زیست وبالِ جان اور سرتاپا بے امان بن گئی۔

بعدِ غمِ جدائیِ سلمیٰ مرے لئے
یادِ زبور و ماتمِ شیون ہے آج کل

9 ستمبر 1948 کو اُردو شاعری کو ایک نئی نوا اور انوکھی ادا سے متعارف کرانے والا اختر شیرانی محض 43 برس کی عمر میں اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اختر شیرانی کی پیروی کرنے والے بہت سے ناموں میں ایک ناصر کاظمی بھی تھے۔ اول اول جنہوں نے اختر شیرانی کے لہجے میں شاعری کی، مگر بعد میں خود ایک لہجہ تراش کر امر ہو گئے۔

شعرستان، نغمۂ حرم، صبحِ بہار، اختر ستان، لالۂ طور، طیورِ آوارہ، وہ مجموعۂ کلام ہیں، جن کو پڑھ کر اختر شیرانی کا اندازِ سخن اُن کے پختۂ فن کی گواہی دیتا نظر آتا ہے۔

ابنِ انشاء: ہمہ صفت ادیب و شاعر

"شاعری کی گرامر کو عروض کہتے ہیں۔ پرانے لوگ عروض کے بغیر شاعری نہیں کیا کرتے تھے۔ آج کل کسی شاعر کے سامنے عروض کا نام لیجئے تو پوچھتا ہے، وہ کیا چیز ہوتی ہے۔ ہم نے ایک شاعر کے سامنے زحافات کا نام لیا۔ بولے خرافات۔ مجھے خرافات پسند نہیں۔ بس میری غزل سنیے اور جائیے۔ عروض میں بحریں ہوتی ہیں، جن میں بعض بہت گہری ہوتی ہیں۔ نو مشق اکثر ان میں ڈوب جاتے ہیں۔ اس لئے احتیاط پسند لوگ شاعری اور عروض کے پاس نہیں جاتے۔ عمر بھر نثر لکھتے رہتے ہیں"۔ یہ شگفتہ طرزِ بیان اُردو کے ممتاز مزاح نگار، ابنِ انشاء کی "اُردو کی آخری کتاب" سے مستعار لیا گیا ہے۔ شاعر، ادیب، مزاح نگار، سفر نامہ نگار، کالم نگار، تبصرہ نگار۔ ایک شخص اور اتنے رُخ اور ہر ہر رُخ سے لوگوں کے دلوں پر راج کرنے والے اس شخص کا نام شیر محمد خان تھا، جو ادبی دنیا میں ابنِ انشاء کے نام سے جانا اور پہچانا گیا۔ 15 جون 1927 کو جالندھر، مشرقی پنجاب کی تحصیل میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ ماں باپ نے خوشیاں منائیں اور طے کیا کہ بچے کو بڑا آدمی بنائیں گے۔ شیر محمد خان کو شعر و شاعری سے شاید فطری لگاؤ تھا۔ بچے کی نوعمری کا زمانہ سیاسی انتشار اور سماجی خلفشار سے پُر تھا۔

فرنگی سامراج برصغیر کے تہذیبی سماج کو تاراج کرنے پر تُلا بیٹھا تھا۔ فرنگی، مقامی لوگوں کو حقارت اور مقامی لوگ فرنگیوں کو نفرت سے دیکھا کرتے تھے۔ شیر محمد ایسی فضا میں اپنے لئے اور اپنے جیسے لوگوں کے لئے اچھے مستقبل کے سپنے دیکھا کرتا تھا۔ شیر محمد جب شعور کی کچھ اور منازل طے کر چکا تو اپنے نظریات کو بائیں بازو کے قریب پایا۔ اسی سبب سے 1945 میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی رکنیت اختیار کی۔ تیزی سے تعلیمی اور ادبی مراحل طے کرنے والا شیر محمد خان شاید کسی ایسی منزل کی تلاش میں تھا، جہاں پہنچ کر وہ امر ہو جاتا اور خوش قسمتی سے ایسا ہی ہوا بھی۔

1946 میں پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کیا۔ 1947 کا سب سے بڑا واقعہ تقسیم ہند تھا۔ شیر محمد اب ابن انشاء کی حیثیت سے حالات و واقعات کو سمجھنے، پرکھنے اور شعر میں برتنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اور تو کوئی بس نہ چلے گا، ہجر کے درد کے ماروں کا
صبح کا ہونا دوبھر کر دیں، رستہ روک ستاروں کا

گرم آنسو اور ٹھنڈی آہیں من میں کیا کیا موسم ہیں
اس بگیا کے بھید نہ کھولو! سیر کرو خاموش رہو

آزادی کے بعد ابن انشاء نے ہجرت، مالی صعوبت اور گھریلو پریشانیوں کی اذیت کا سامنا کیا، مگر فطری رجائیت پسندی اور ظریفانہ انداز نے اُن تمام رکاوٹوں کو دُور کر دیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد ابنِ انشاء نے کراچی میں سکونت اختیار کی، مگر لاہور کی صحبتیں، یادیں، حسین صبحیں اور شامیں پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ اُسی لاہور اور اُن ہی صحبتوں کی یاد میں غزل کہی

انشاء اب ان اجنبیوں میں چین سے باقی عمر کٹے
جن کی خاطر بستی چھوڑی، نام نہ لو اُن پیاروں کا

1953 میں کراچی یونیورسٹی سے ایم اے کی سند حاصل کرتے ہی عملی زندگی کا آغاز ہو چلا۔ ابتدائی تحریری سفر کتابوں پر تبصروں، ادبی ڈائری اور ادبی تقاریب کے احوال سے ہوا۔ اسی کے پہلو بہ پہلو مزاحیہ مضامین کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ اب ابن انشاء اپنے نام اور کام سے پہچانے جانے لگے۔ روزنامہ امروز پاکستان کے ابتدائی وقتوں کا ایسا اخبار تھا، جو ادیبوں اور شاعروں کی نگارشات کو خصوصی اہمیت دیا کرتا تھا۔ مشہور ادیب، شاعر اور کالم نگار، چراغ حسن حسرت "حرف و حکایت" کے نام سے کالم تحریر کیا کرتے تھے۔

اُن کی وفات (1955) کے بعد یہ ذمے داری مشہور شاعر اور افسانہ نگار، احمد ندیم قاسمی کو

سونپ دی گئی۔ اسی اخبار کے کراچی ایڈیشن کے لئے ابن انشاء کا انتخاب کیا گیا، جسے وہ لگ بھگ ایک عشرے تک وقفوں کے ساتھ "درویش دمشقی"، "حاجی بابا اصفہانی" اور "پہلا درویش" کے قلمی ناموں سے چلاتے رہے۔ روزنامہ انجام کراچی میں ساٹھ کے وسط عشرے میں "باتیں انشاء جی کی" کے عنوان سے اُن کا قلم شگفتہ بیانی کے جوہر دکھاتا رہا۔ اس سے اگلی منزل "اخبار خواتین" میں "آپ سے کیا پردہ" تھی۔ کالم نگاری کا یہ سلسلہ 1966 میں قائم ہوا۔ 1967 میں "اخبار جہاں" کا اجراء ہوا اور اس میں بھی کالم کا عنوان "باتیں انشاء جی کی" تھا۔ ان کالموں میں وہ سفر کے مشاہدات اور تجربات بیان کرتے تھے۔ 1963 میں ایران کا سفر اختیار کیا، جس کا مکمل احوال روزنامہ حُریت میں شائع ہوا۔ 1964 میں سری لنکا گئے تو اس کا احوال روزنامہ انجام میں بیان کیا۔ روزنامہ جنگ میں اُن کے کالم کا عنوان "دخل در معقولات" تھا۔ "آوارہ گردی کی ڈائری" بھی روزنامہ جنگ ہی کا ایک سلسلہ تھا۔ 1969 میں روزنامہ امروز میں "بقلم خود" کے عنوان سے کالم تحریر کئے۔ اُنہوں نے اپنے کالموں میں مزاح نگاری کا اعلیٰ ترین معیار قائم کیا۔

اُن سے پہلے سفرنامے سفرنامہ نگار کے محض سنجیدہ تجربات اور مشاہدات کے عکاس ہوا کرتے تھے۔ رسمی اور مبنی بر تکلف پیرائے کو ترک کرتے ہوئے ابن انشاء نے اسے غیر رسمی اور بے تکلفانہ بنا دیا۔ اُن کے کالم مقدار کے ساتھ معیار برقرار رکھنے کی بہترین مثال قرار دیے جا سکتے ہیں۔ اب اُن کے قلم کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ کراچی میں قیام کے دوران اُنھیں بابائے اُردو مولوی عبدالحق سے ملنے کے بہت مواقع نصیب ہوئے۔

صدر ایوب خان کے زمانے میں مغربی پاکستان کے ادیبوں کا ایک وفد مشرقی پاکستان (اب بنگلہ دیش) پہنچا۔ اراکین میں قدرت اللہ شہاب، جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال، اشفاق احمد، نسیم حجازی، اے حمید، محمد خالد اختر، عبدالعزیز خالد، شہرت بخاری، شاہد احمد دہلوی، اعجاز بٹالوی، میرزا ادیب، تجمل حسین اور ابن انشاء شامل تھے۔ مشہور بنگالی شاعر جسیم الدین سے ہونے والی ملاقات میں کھانے کے بعد فرشی نشست کا اہتمام کیا گیا۔ اس نشست میں جسیم الدین کی دو بیٹیوں کوتا اور جھرنا نے رقص بھی کیا۔ بلبل اکیڈمی میں زیرِ تربیت جھرنا کا رقص دیکھ کر لوگ دنگ

رہ گئے۔ وہاں سے واپسی کے بعد ابنِ انشاء جھرنا سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے جھرنا سے شادی کا ارادہ کر لیا۔ یہ جھرنا بعد میں فلم اداکارہ شبنم کے نام سے ایک زمانے تک لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتی رہی۔

ابنِ انشاء نے مختلف حکومتی اداروں میں ملازمت اختیار کی، جن میں ریڈیو پاکستان، وزارتِ زراعت اور نیشنل بُک سینٹر آف پاکستان قابلِ ذکر ہیں۔ اقوامِ متحدہ کے ساتھ وابستگی میں جن ممالک کا سفر اختیار کیا، اُن میں جاپان، فلپائن، چین، ہانگ کانگ، تھائی لینڈ، انڈونیشیا، ملائشیا، انڈیا، افغانستان، ایران، ترکی، فرانس، برطانیہ اور امریکا شامل ہیں۔ "چاند" ابنِ انشاء کی زندگی کا سب سے مضبوط استعارہ تھا۔ شاید یہی سبب تھا کہ اُن کا پہلا مجموعہ "چاند نگر" کے نام سے سامنے آیا۔ طنز و مزاح ابنِ انشاء کا اعزاز اور طرۂ امتیاز رہا۔

ابنِ انشاء کی ایک غزل ستر کی دہائی میں بہت مشہور ہوئی۔ "انشاء جی اُٹھو اب کوچ کرو، اس شہر میں جی کو لگانا کیا"۔ اُس زمانے کے مشہور ترین غزل گائیک استاد امانت علی خان نے اپنی پُرسوز آواز میں غزل گا کر ابنِ انشاء اور خود اپنے آپ کو امر کر لیا۔ جنوری 1974 میں یہ غزل پاکستان ٹیلی ویژن پر نشر ہوتے ہی ناظرین نے ٹی وی انتظامیہ کو خطوط کی بھرمار کے ذریعے دوبارہ نشر کرنے کا مطالبہ کیا۔ استاد امانت علی خان اس غزل کی مقبولیت سے بے حد مسرور تھے۔ اس غزل کی شہرت کو کچھ ہی وقت گزرا تھا کہ ایک دن استاد امانت علی خان انتقال کر گئے۔ جنوری 1978 میں جب اس غزل کو نشر ہوئے محض چار ہی برس ہوئے تھے، خود ابنِ انشاء بھی انتقال کر گئے۔ 2006 میں اسد امانت علی نے پی ٹی وی کے لئے ایک کنسرٹ کیا اور جو غزل گانے کے لئے منتخب کی، وہ وہی تھی جسے ابنِ انشاء نے لکھا تھا۔ وہ غزل اسد امانت علی کی بھی آخری غزل ثابت ہوئی۔

ابنِ انشاء کی شاعری کے مجموعے "اس بستی کے اک کوچے میں"، "چاند نگر"، "دلِ وحشی"، "بلّو کا بستہ" تھے۔ اُنہوں نے جو سفرنامے تحریر کئے، اُن میں "آوارہ گرد کی ڈائری"، "دنیا گول ہے"، "ابنِ بطوطہ کے تعاقب میں"، "چلتے ہو تو چین کو چلیے"، "نگری نگری پھرا مسافر"، جب کہ

طنز و مزاح میں " آپ سے کیا پردہ "، " خمار گندم "، " اردو کی آخری کتاب " اور " خط انشاء جی کے " شامل ہیں۔ اُن کی شاعری اور نثر ایک دوسرے کی توثیق نہیں، بلکہ تنسیخ کا عمل دکھائی دیتی ہیں۔ شاعر ابنِ انشاء، یاس اور مزاح نگار ابنِ انشا فرحت آگیں احساس کا پہلو رکھتا ہے۔

تراجم اور شاعری سے ہٹ کر اُن کی اوّلین نثری تحریر " برف کی پوٹلی " تھی، جو 1965 کی پاک بھارت جنگ کا مختصر احوال تھا۔ " چلتے ہو تو چین کو چلیے " ابن انشاء کی پہلی سنجیدہ نثری کاوش قرار دی جاسکتی ہے۔ اسے شگفتہ بیانی کا شاہکار قرار دیا جاسکتا ہے۔ " اردو کی آخری کتاب " جو 1971 میں سامنے آئی، وہ ابن انشاء کے مخصوص شگفتہ انداز اور طنز کی خوب صورت مثال ہے۔ اس کتاب میں ملک کے سیاسی اور سماجی حالات پر طنز کی عمدہ مثالیں موجود ہیں۔ " آوارہ گرد کی ڈائری " بھی اسی برس شائع ہوئی۔ سفری احوال میں بذلہ سنجی کی ایک دنیا آباد کی گئی تھی۔ اس کتاب کو بھی قارئین کی جانب سے بھرپور پذیرائی ملی۔

اس کے بعد سامنے آنے والی کتابیں " دنیا گول ہے " (1972)، " ابن بطوطہ کے تعاقب میں " (1974)، بھی سفرناموں کے مشاہدات پر مبنی تھیں۔ " خمار گندم " (کالموں کا مجموعہ) 1980 اور " نگری نگری پھرا مسافر " (سفرناموں کا مجموعہ) 1989 اُن کی وفات کے بعد شائع ہونے والی کتابیں تھیں۔ 11 جنوری 1978 کو یہ فطری مزاح نگار لندن کے ایک اسپتال میں بیماری سے لڑتے ہوئے انتقال کر گیا۔
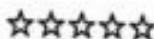
بہادر شاہ ظفر کی شعری و ادبی خدمات

بادشاہت سے قیدی، محل سے زندان کی کال کوٹھری اور شاعری سے موسیقی تک کا سفر کرنے والی ایک ہستی ایسی بھی ہے جسے دنیا بہادر شاہ ظفر کے نام سے جانتی اور پہچانتی ہے۔ اگرچہ کچھ اسی سے ملتی جلتی صورت اودھ کے آخری بادشاہ واجد علی شاہ کی بھی رہی تھی۔ زندگی میں ظفر کو کس حد تک ظفر مندی ملی، یہ طے کرنا کارِ دشوار تو نہیں، تاہم فلکِ شاعری پر ظفر مانندِ قمر چمکتا دمکتا ضرور نظر آتا ہے۔ غالبؔ، داغؔ، مومنؔ، اور ذوقؔ کے ہم عصر بہادر شاہ ظفر کو اُس وقت کی عالمانہ فضا نے اور قدرت کی عطا نے بالارادہ شعر و ادب کا دلدادہ بنا دیا۔ 24 اکتوبر 1775 کو تاریخی شہر دلّی میں مغل بادشاہ اکبر شاہ ثانی کے محل میں پیدا ہونے والے بچے کا نام ابو ظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ رکھا گیا۔

شاہ عالم ثانی کے پوتے اور اکبر شاہ ثانی کی سترہ اولادوں میں سے ظفر سب سے بڑی اولاد تھے۔ ظفر کے بعد مرزا بابر اور اُن کے بعد مرزا جہانگیر تھے، جنہیں اکبر شاہ ثانی ولی عہدی کے منصب پر فائز دیکھنا چاہتے تھے۔ تاہم اکبر شاہ ثانی کی تمام تر کوششوں کے باوجود جب مرزا جہانگیر کو یہ منصب نہ مل سکا تو انہوں نے مرزا سلیم کے لئے اسی طرح کی سعی کی، مگر اس میں بھی ناکامی ہوئی۔ باپ نے آخری کوشش کے تحت بیٹے پر بدکرداری کا الزام بھی عائد کر دیا اور اسی کے ساتھ بھائی جہانگیر قدر نے دو بار زہر دے کر راستے سے ہٹانے کی بھی کوشش کی، مگر قسمت کی دیوی ظفر پر بڑی شان سے مہربان رہی اور یوں تخت نشینی ظفر کا مقدر ٹھہری اور وہ 28 ستمبر 1837ء کو بادشاہت کے منصب پر فائز ہوئے۔ ایسی بادشاہت جو برائے نام تھی اور جس کا دائرہ اثر محض دلّی تک محدود تھا۔ جس وقت ظفر کی تخت نشینی عمل میں آئی تو اسی کے ساتھ انگریزوں نے اس تخت نشینی کے وقت پیدا ہونے والے نزاعی معاملے سے سبق سیکھتے ہوئے ظفر کے جانشین کا انتخاب بھی کر لیا اور اُن کے فرزند مرزا دارا بخت اس عہدے کے لئے تیار کر دیئے گئے۔ اٹھارویں صدی کا آغاز

مغل حکومت کے لئے پریشانی کا ابتدائی سلسلہ اور وسط مکمل ابتلا کا دور ثابت ہوا۔ شاہ عالم ثانی کا عہد آتے آتے مغل بادشاہ کی حیثیت یہ رہ گئی کہ وہ انگریزوں سے وظیفہ پانے والے ایک نمائشی بادشاہ بن کر رہ گئے اور اُن کا حکومتی معاملات اور تنظیم سے تعلق کم سے کم ہوتا چلا گیا اور بہادر شاہ ظفرؔ کا عہد آتے آتے اس منصب کی بے توقیری شاید آخری حدوں تک پہنچ گئی۔ ظفرؔ کی ابتدائی زندگی شاہ عالم ثانی کی زیرِ نگرانی تحصیلِ علم میں گزری۔ دادا کی زیرِ نگرانی تربیت پانے والے پوتے نے مختلف علوم وفنون اور زبان میں مہارتِ تامّہ حاصل کی۔ دادا شاہ عالمؔ خود بھی عمدہ کلام کہتے تھے اور اُن کا یہ شعر ضرب المثل ہے۔

اب تو آرام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے

قلعۂ معلی میں انتہائی تزک واحتشام سے تربیت پانے والے ظفرؔ نے لال قلعے کی تہذیبی زندگی اور مشاغل میں ڈوب جانا اُس وقت کی زندگی کا مقصد مانا۔ اردو، ہندی، عربی، فارسی، وہ زبانیں تھیں، جن میں بہادر شاہ ظفرؔ نے قدرت حاصل کی۔ موسیقی، ہاتھی دانت کی نقاشی، خطاطی اور سپہ گری سے انہیں خاص دلچسپی تھی۔ تصوّف کی تعلیم بہت چاؤ اور لگاؤ سے حاصل کی اور یہاں تک ہوا کہ گلستاں کی شرح علمِ تصوّف میں بیان کی۔ تاہم بہادر شاہ ظفرؔ بادشاہوں کی شاہانہ طبیعت کے عین مطابق عیش وعشرت کے متوالے ثابت ہوئے۔ شراب نوشی سے دُور، تاہم عیش کوشی سے مجبور ظفرؔ ناچ گانے کے شیدائی اور فدائی تھے۔ محل میں محفلِ رقص وسرور شاید ظفرؔ کے وجود کا حصّہ تھی۔ عمر کے پینسٹھویں برس زینت محل بیگم سے عقد کیا۔ اکہترویں برس ایک اور نکاح شاہ آبادی بیگم سے کیا گیا۔ بہترویں برس میں جس سے نکاح کیا، اُسے اختر محل کے خطاب سے نوازا۔ تاہم زینت محل سے محبت کی شدت اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ دہلی کے بازار لال کنواں میں اُس کے لئے ایک حویلی بھی تعمیر کرائی۔ یہ باتیں تو اپنی جگہ، ظفرؔ اپنی رعایا سے بے حد محبت رکھتے تھے۔

ایک واقعہ ظفرؔ کی رعایا پروری اور مزاج سروری کی تصویر پیش کرتا نظر آتا ہے۔ ہوا یوں کہ

انگریز حکومت کی طرف سے احکام آئے کہ شہر دلی کے گھوسی (گائے، بھینسوں کے رکھوالے) اپنے جانور لے کر شہر سے باہر آباد ہو جائیں۔ چنانچہ حکم کی تعمیل میں جمنا کے کنارے ڈیرے ڈال دیئے گئے۔ بہادر شاہ ظفر کو اطلاع ہوئی تو انہوں نے بھی جمنا کے کنارے یہ کہہ کر پڑاؤ اختیار کیا کہ میری موجودگی میں رعیت گھر سے بے گھر ہو، مجھے گوارا نہیں اور بالآخر انگریز سرکار کو حکم واپس لینا پڑا۔

1857ء کی بغاوت کا آغاز ہوا۔ اطراف دلی ہنگاموں کی زد میں تھا۔ انگریزوں کے خلاف باغیوں کا رویہ جارحانہ اور مخاصمانہ ہو گیا۔ لوگ بادشاہ کی سمت اس اُمید میں دیکھنے لگے کہ وہ تحریک کی قیادت بہ انداز شجاعت کریں گے اور پیرانہ سال بادشاہ نے بھی پیری میں جوانی کو صدا دی اور باغیوں کی طاقت کو جلا دی۔ تاہم مناسب حکمت عملی کے فقدان نے باغیوں کو مسلسل پریشان رکھا اور بالآخر انہیں شکست ہوئی۔

بہادر شاہ ظفر کو بطور سزا رنگون بھیج دیا گیا، جہاں در زنداں اُن کی رہائی کے امکان کو تاریک تر کر گیا، تاہم اس دور زندانی کے ہیجانی اور طوفانی احساسات اُن کی شاعری کے کمالات بن گئے۔ بلبل، قفس، صیاد، زنداں، زنجیر اُن کے کلام کی تکلمی تصویر بن گئی۔

نصیب اچھے اگر بلبل کے ہوتے
تو کیوں پہلو میں کانٹے گل کے ہوتے

میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں نگہ بانوں کو
میری زنجیر کی آواز نے سونے نہ دیا

برپا نہ کیوں ہو خانۂ زنداں میں روز غل
میرے جنوں سے اب تو سلاسل پہ بن گئی

قفس کے ٹکڑے اُڑا دوں پھڑک پھڑک کر آج
ارادہ میرا اسیران ہم قفس یوں ہے

دیکھنا اک دن جلا کر خاک کر دے گا
مجھے کام ہی میرے کبھی سوز دروں آ جائے گا

ظفر کے پہلے استاد شاہ نصیر تھے۔ اُس کے بعد عزت اللہ عشق کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا۔ میر کاظم حسین بے قرار اس کے بعد اتالیق ظفر کے طور پر سامنے آئے۔ ذوق دہلوی نے اُس کے بعد ظفر کو اصلاحِ سخن دی اور اُس کے بعد مرزا غالب نے یہ خدمت انجام دی۔ ظفر کا دربار شاہی دربار کم اور شعری دربار زیادہ نظر آنے لگا۔ سخن فہم اور سخن سنج دربار کی زینت اور طاقت بننے لگے۔ حکیم ثناء اللہ فراق، میر غالب علی سید، عبدالرحمان خاں احسان، برہان الدین خاں زار، حکیم قدرت اللہ قاسم، حکیم عزت اللہ عشق، میاں شکیبا، مرزا عظیم، میر قمر الدین منت، میر نظام الدین ممنون وغیرہ حاضرینِ دربار اور شاعری کا افتخار بنے نظر آتے تھے۔ ابتدائی تربیت، اساتذہ کی مہارت، ماہرینِ فن کی صحبت اور خود بہادر شاہ ظفر کی محنت خوب رنگ لائی اور اُنہوں نے شاعری کی مختلف اصناف میں جوہرِ سخن دکھائے۔

جن اصناف کو برتا، ان میں مستزاد، مخمس، مثلث، مسدس، تضمین، قصیدہ، سلام، مرثیہ، مجرا، شہر آشوب، رباعی، قطعہ، سہرا، پنکھا، گیت، بھجن، ہولی، ٹھمری، دوہے وغیرہ شامل ہیں۔ تاہم غزل اُن کی محبوب و مرغوب صنفِ سخن رہی۔ چار ضخیم شعری تصانیف کے علاوہ "خیابانِ تصوف" شیخ سعدی شیرازی کی مشہورِ زمانہ اور غیر متصوفانہ "گلستانِ سعدی" کی متصوفانہ تشریح و تعبیر ہے۔ "تالیفاتِ ابوظفری" لغت اور اصطلاحِ دکن کے موضوع پر ہے۔ بدقسمتی کی بات یہ ہوئی کہ چار ضخیم شعری دیوان کے خالق ہونے کے باوجود بہادر شاہ ظفر کی شاعری "ذوق کی مرہونِ منت" قرار دی گئی اور ایسا اُردو کے اُس پہلے بے نظیر تذکرے کی بدولت ہوا، جس کے خالق مشہور انشاء پرداز محمد حسین آزاد تھے، جنہوں نے "آبِ حیات" میں ظفر کے باب میں یوں خطاب کیا: "مسودہ خاص میں کوئی شعر پورا، کوئی ڈیڑھ مصرع، کوئی ایک، کوئی آدھا مصرع، فقط بحر، ردیف اور قافیہ معلوم ہوتا تھا، باقی بخیر۔ یہ (ذوق) ان ہڈیوں پر گوشت پوست چڑھا کر حسن و عشق کی پتلیاں بنا دیتے"۔

تاہم بہت سے معتبر تذکرہ نگار اور نقاد آزاد کی رائے کو غلط قرار دیتے ہیں۔ نواب نصیر حسین خیالؔ "مغل اور اردو" میں کہتے ہیں: "پروفیسر آزاد نے تو عشقِ ذوقؔ میں بہادر شاہ کے نام اور اُس کی شاعری تک کو مٹانا چاہا ہے، مگر جنہیں حقیقی طور پر قلعہ معلیٰ اور اُس کی وجہ سے اردوئے معلیٰ سے واسطہ رہا ہے، وہ اُردو کو جانتے اور پہچانتے ہیں۔ ظفرؔ و ذوقؔ کی زبان میں شاہ و گدا کا فرق ہے"۔ ظفرؔ کے بہت سے اشعار آج بھی نوکِ زبان اور شاعری کی آن بان اور شان ہیں۔

یا مجھے افسرِ شاہانہ بنایا ہوتا
یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا

کتنا ہے بد نصیب ظفرؔ دفن کے لئے
دو گز زمین بھی نہ ملی، کوئے یار میں

لے گیا چھین کے گو آج ترا صبر و قرار
بے قراری تجھے اے دل کبھی ایسی تو نہ تھی

کھلتا نہیں ہے حال کسی پر کہے بغیر
پر دل کی جان لیتے ہیں دلبر کہے بغیر

دیکھتے ہیں خواب میں جس دن کسو کی چشمِ مست
رہتے ہیں ہم دو جہاں سے بے خبر دو دن تلک

تم نے کیا نہ یاد کبھی بھول کر ہمیں
ہم نے تمہاری یاد میں سب کچھ بھلا دیا

حالات کے شکنجے میں آیا ہوا ایک مجبور اور وطن سے کوسوں دور تاریخ کا نمائشی بادشاہ بے بسی اور بے کسی کی حالت میں 7 نومبر 1862ء کو انتقال کر گیا۔

☆☆☆☆☆

پروین شاکر: شاعری کو "خوشبو" عطا کرنے والی

عُمر کی دوسری دہائی۔ جب لڑکیاں عموماً سپنے دیکھنا، سپنوں کی باتیں کرنا اور سپنوں میں باتیں کرنا پسند کرتی ہیں۔ ایسی ہی ایک لڑکی، پروین جو سپنے تو ضرور دیکھا کرتی تھی، مگر اسی کے ساتھ سپنوں کو اظہار کے لطیف پیرائے میں بیان کرنے کا ہنر بھی جانتی تھی۔ شاید اس کا سبب گھر کی تہذیبی و ادبی فضا تھی۔ 24 نومبر 1952 کو کراچی میں پیدا ہونے والی پروین شاکر اپنے والدین کی دوسری اولاد تھی۔ بڑی بیٹی نسرین شاکر تھی۔ پروین کے والد سیّد شاکر حسین تقسیم ہند سے قبل حسین آباد (بہار)، ہندوستان میں مقامی مشاعروں میں شرکت کرتے۔ ترنّم سے کلام پڑھا کرتے۔ تقسیم کے بعد کراچی آئے تو معاشی تنگ و دو نے شاعری سے دُوری پیدا کر دی۔ تاہم شاعرانہ ذوق کی تسکین کے لیے مسالمے اور مجالس میں کلام پڑھتے۔ علامہ طالب جوہریؔ کے والد اور ممتاز عالم دین مولانا محمد مصطفیٰ جوہرؔ کا شاگرد ہونے کے باعث اُن کی خصوصی توجہ کا مرکز تھے اور اُن ہی کا کلام جب لحن سے پڑھتے تو سماں باندھ دیتے۔ یوں پروینؔ کا ادبی ذوق خاندانی پس منظر کے تحت پروان چڑھنے لگا۔ اوائل عُمری ہی سے حرف سے رشتہ اور لفظ سے ناتا پروینؔ کا من بھاتا کارِ مشغلہ تھا۔ کتاب اوّل و آخر پروین کی دم ساز اور ہم راز تھی۔ کچھ سوچنا پھر کچھ کہنا اور اُسی کیفیت میں تا دیر رہنا اُس کے لیے بسا غنیمت تھا۔ اُردو اور انگریزی ادب کا ہمہ وقت مطالعہ شخصیت کو مضبوط بنانے کا عمل جاری رکھے ہوئے تھا۔ بنیادی تعلیم رضویہ گرلز ہائی اسکول، ناظم آباد سے حاصل کی۔ یہ منزل طے کرنے کے بعد جب کالج کی زندگی میں قدم رکھا تو اوّل سرسیّد گرلز کالج سے بی اے اور پھر جامعہ کراچی سے انگریزی ادب میں ایم اے کیا۔ پڑھنے کے ساتھ لکھنے کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ ابتدا میں تخلّص بیناؔ پسند کیا۔ تاہم جلد ہی پروینؔ ادبی زندگی کا حصّہ بنا لیا۔ اپنے الہڑ، کچے اور ناتراشیدہ الفاظ کو نثر کے مقابلے میں نظم کا پیکر عطا کرنے والی لڑکی شاید شادؔ عظیم

آبادی کی اس بات کو گرہ میں باندھ چکی تھی۔

اثر زیادہ ہو سامع پہ نثر کی نسبت
اسی لیے ہے فقط شعر و شاعری کی بِنا

کالج اور یونی ورسٹی کی زندگی میں احساس کو اظہار کے مواقع زیادہ تھے۔ بیت بازی کے مقابلے، شعروشاعری کا انعقاد، مقابلہ مضمون نویسی، تقریری مقابلے۔ غرض ایک سے بڑھ کر ایک تقریب، جو تحریری تحریک کو مہمیز دیا کرتی تھی۔ اُدھر اخبارات کے صفحات طلبا و طالبات کی تحریروں کو اشاعت کا لبادہ اوڑھا کر اُن کے نام کو استحکام دینے کے لیے آمادہ و کمر بستہ تھے۔ یوں فضا طبیعت کو مزا اور ادب کو بقا دینے کے لیے سازگار ترین تھی۔ عمر کا محض پندرھواں برس تھا جب 1967 میں ریڈیو پاکستان کراچی سے سپنے دیکھنے والی لڑکی کا حقیقت میں پہلا پروگرام نشر ہوا۔ ریڈیو اُس کے لیے ایک درس گاہ اور اُسے وہاں متعارف کرانے والے یاور مہدی ایک مدرّس ثابت ہوئے۔ ریڈیو کے پروگرامز میں پیہم شرکت پروین کو اعتماد کی دولت سے مالا مال کر رہی تھی۔ اُس کے بعد ریڈیو ہی کے پروگرامز پر اخبارات میں تبصرے شائع ہونے لگے تو اہلِ شہر اُس نام سے مانوس ہونا شروع ہو گئے۔

اب پروین مشاعروں کی جانب متوجہ ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب خواتین شعراء کی تعداد برائے نام تھی۔ پروین کی صورت میں کراچی کی ادبی فضاؤں میں ایک نسوانہ آواز نئے ڈھب اور انداز کے ساتھ اہلِ شہر کی سماعتوں کو اپنی جانب متوجہ کرنے لگی۔ ایسی آواز جو تازہ ہوا کا جھونکا اور پیکر جو مشرقی عورت کا مکمل سراپا تھا۔ رفتہ رفتہ شعر گوئی اُس کی پہچان اور شان بن گئی۔ اب ریڈیو کے ساتھ اور اخبارات اور رسائل کے پہلو بہ پہلو ٹیلی ویژن بھی پروین کی رسائی اور لہجہ و نسائی کا نشر کنندہ قرار پایا۔ جس کی وسعت اور وساطت سے پروین اہلِ وطن کی نگاہوں کا مرکز قرار پائی۔ اب وہ ایسی شاعرہ کے رُوپ میں افقِ شعر پر آئی جس نے نسوانی لہجے کو ایک ایسی شناخت عطا کی، جس سے اُردو شاعری اب تک محروم تھی۔ یہ رُوپ پروینؔ پر خوب سجنے لگا۔ پروینؔ کا حلقہء

احباب وسیع ہو چلا۔ نامور شاعر اور ادیب باتوں اور ملاقاتوں کا حصہ بن گئے۔ اب شہر ہی نہیں شہر سے باہر بھی اُس کی شعریت اور شخصیت پر گفتگو ہونے لگی۔

برصغیر کے ممتاز شاعر اور ادیب، احمد ندیم قاسمی سے میل جول پروین کے لیے سعد ثابت ہوا۔ بزرگی نے خوردی کا خیر مقدم والہانہ اور مشفقانہ انداز میں کیا اور جلد ہی پروین کے لیے احمد ندیم قاسمی ''عمو'' بن گئے۔ عمر کی محض چوبیسویں منزل تھی، جب پروین کا پہلا مجموعہ کلام ''خوشبو'' منظر عام پر آیا، جس نے اس قدر مقبولیت حاصل کی کہ اُس زمانے کی ''بیسٹ سیلر بک'' کا اعزاز پایا۔ پروین نے کتاب کا انتساب اپنے اُسی ''عمو'' کے نام کیا، جو باقی دنیا کے لیے احمد ندیم قاسمی تھے۔ ''خوشبو'' کی نکہت کا یہ عالم ہوا کہ مصرعہ اور شعر پرواز کرتا دکھائی دینے لگا اور گلیوں اور کوچوں میں سنائی دینے لگا۔

کو بہ کو پھیل گئی بات شناسائی کی
اُس نے خوشبو کی طرح میری پزیرائی کی

وہ تو خوشبو ہے ہواؤں میں بکھر جائے گا
مسئلہ پھول کا ہے پھول کدھر جائے گا

عکسِ خوشبو ہوں بکھرنے سے نہ روکے کوئی
اور بکھر جاؤں تو مجھ کو نہ سمیٹے کوئی

چلی ہے تھام کے بادل کے ہاتھ کو خوشبو
ہوا کے ساتھ سفر کا مقابلہ ٹھہرا

قریۂ جاں میں کوئی پھول کھلانے آئے
وہ مرے دل پہ نیا زخم لگانے آئے

میں سچ کہوں گی مگر پھر بھی ہار جاؤں گی
وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کر دے گا

کمالِ ضبط کو خود بھی تو آزماؤں گی
میں اپنے ہاتھ سے اُس کی دلہن سجاؤں گی

جگنو کو دن کے وقت پرکھنے کی ضد کریں
بچے ہمارے عہد کے چالاک ہو گئے

اب وہ منزل بھی آئی جس میں پروین پیا دیس سدھار گئی۔ اب شریکِ حیات زندگی کی خوشیوں اور غموں میں اُس کی دلداری اور ساجھے داری کے لیے موجود تھا۔ ماں باپ کی دہلیز چھوٹ گئی۔ سکھیاں، سہیلیاں چھوٹ گئیں۔ بابل کی گلیاں چھوٹ گئیں۔ نئے رشتے بنے۔ مگر نہ چھوٹا تو کتاب، قلم، حرف اور لفظ اور معنیٰ سے رشتہ۔ کچھ وقت بعد پروین ایک اور رشتے میں بندھی اور وہ رشتہ تھا ماں اور بیٹے کا۔ اب پروین کی نگاہوں کا مرکز اور مراد اُس کا بیٹا مراد (گیتو) قرار پایا۔ گویا پروین کے لیے کائنات مکمل ہو گئی۔ تاہم خوشی کا سفر عارضی اور مختصر نظر آنے لگا۔ ازدواجی معاملات اونچ نیچ کا شکار ہو گئے۔ رشتوں کا اعتبار ایسی کچی دیوار ثابت ہوا، جو موسم کی پہلی بارش کا سامنا کرتے ہی زمیں بوس ہو گئی۔ زندگی ایک جاں گسل عمل اور عقدہ ءِ لاینحل بن گئی۔ رشتوں کی شناسائی اور اکائی شاید تقدیر کو پسند نہیں آئی۔ بالآخر بات علیحدگی تک آ گئی اور فریقین اپنی اپنی راہوں پر گامزن ہو گئے۔ مگر پروین کی منزل ابھی دُور تھی۔ اُس نے پہلے تدریس کا پیشہ اپنایا اور پھر مقابلے کے امتحان میں شاندار کامیابی حاصل کر کے کسٹمز کے محکمے میں ملازمت اختیار کر لی۔

1986 میں سینٹرل بورڈ آف ریونیو میں سیکنڈ سیکریٹری کے طور پر وابستگی اختیار کی۔ شہرت کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ 1990 میں صدارتی تمغۂ حُسنِ کارکردگی سے نوازا گیا۔ آدم جی ایوارڈ بھی پروین کے حصے میں آیا۔ اس دوران میں "صد برگ"، "خود کلامی" (ہجرہ ایوارڈ معہ نقد

رقم) اور "انکار" اظہار کا پیکر اختیار کر چکے تھے۔ پروین نے ہارورڈ یونی ورسٹی سے بینک ایڈمنسٹریشن کی ڈگری بھی حاصل کی۔ "1971 کی جنگ میں ذرائع ابلاغ کا کردار" پر پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ بھی تیار کیا جا چکا تھا، جسے ہارورڈ یونیورسٹی ہی میں جمع بھی کرایا جانا تھا، مگر شاید اُس کا وقت بھی نہیں آنا تھا۔ کیونکہ پروین کی منزل دُور تھی، بہت دُور اور اُسے منزل تک پہنچنے کی جلدی بھی بہت تھی۔ اسی لیے شاید "ماہِ تمام" کے عنوان سے کلیات بھی شائع ہو کر سامنے آ گئی۔ پہلے مجموعہ کلام "خوشبو" میں پروین شاکر نے کسی جگہ کہا ہے۔

مرا نوحہ کناں کوئی نہیں ہے
سو اپنے سوگ میں خود بال کھولوں

تاہم امر حقیقت یہ ہے کہ 26 دسمبر 1994 کی صبح اسلام آباد کی ایک سڑک پر ٹریفک حادثے میں اجل کی آواز پر بہ انداز عجلت لبیک کہنے والی پروین کی موت پر پوری اُردو دنیا نوحہ کناں تھی، کیونکہ غزل کی مانگ اجڑ چکی تھی۔ من موہنی صورت، افسانوی شہرت، تعلیمی قابلیت، غیر معمولی صلاحیت، اعلیٰ ترین سرکاری ملازمت، محض بیالیس برس کی عمر میں اس قدر مشقت۔

تمہیں فرصت ہی فرصت ہے میسر
مجھے کرنے کو ہیں کچھ کام جلدی

☆☆☆☆☆

جوشؔ کی شاعری میں صوتی اثرات

(غیر منقسم ہندوستان میں فرنگی راج کو اپنی پُر جوش اور ولولہ انگیز شاعری سے للکارنے والی سب سے بڑی آواز جوشؔ ملیح آبادی کی تھی۔ جہاں اُن کی نظموں نے انگریز سرکار کے ایوان اقتدار میں غم وغصہ کی لہر دوڑادی، وہاں عوام کے دلوں میں آزادی کی آگ لگادی۔ اُن کی نظموں نے مقبولیت اور محبوبیت کی وہ معراج حاصل کی کہ ''شاعر انقلاب'' اُن کے نام کا جزو بن گیا۔ سیاسی نظموں کے پہلو بہ پہلو جوشؔ نے مذہبی شاعری میں بھی نئی طرز فکر اپنائی۔ مناظر فطرت پر اُن کی نظمیں الگ شناخت کی حامل ہیں۔ رُباعی اُن کی دلچسپی کا مستقل موضوع رہا۔ خمریات میں اُن کی شاعری کا رنگ اُن کی مزاجی ترنگ کا عکاس نظر آتا ہے اُنہوں نے اُردو شاعری کو سترہ مجموعہ کلام عطا کیے۔ اُن کی نثری کتاب ''یادوں کی برات'' اُردو ادب کی مقبول ترین کتب میں شمار کی جاتی ہے۔ فروری اُن کی یادوں کو تازہ کرنے کا مہینہ ہے، سو اس مناسبت سے ذیل میں ڈاکٹر قمر عباس کا مضمون پیش کیا جارہا ہے۔ انہوں نے ایک نئے زاویے سے ''جوشؔ کی شاعری میں صوتی اثرات'' کا جائزہ لیا ہے۔ ادارہ، جنگ)

صوت کے لغوی معنی آواز کے ہیں۔ صوتی اثرات کسی تصویر یا تخیل کو ابھارنے میں بہت مدد دیتے ہیں اور بعض اوقات تو محض صوتی اثرات ہی سے کسی واقعے یا منظر کی صحیح عکاسی کی جاسکتی ہے۔ روزمرہ واقعات یا مشاہدات جو ہمارے اردگرد رونما ہوتے ہیں یا جن کو ہم اپنے سامنے وقوع پذیر ہوتے دیکھتے ہیں تو اس کے بیان کرنے میں بھی ہم اکثر صوتی اثرات کو کام میں لاکر اس واقعے یا منظر کی تصویر کشی کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں اگر چند ایک مثالیں بیان کی جائیں تو بات کو سمجھنے میں کافی آسانی ہوسکتی ہے۔

"اچانک تڑاتڑ گولیاں برسنے لگیں"۔

"اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے"۔

"چھما چھم گھنگھرو بجنے لگے"۔

"وہ دھم سے نیچے آ گرا"۔

مذکورہ بالا مثالوں میں "تڑاتڑ"، "ٹپ ٹپ"، چھما چھم" اور "دھم" وہ الفاظ ہیں جو کسی کیفیت کی عکاسی کر رہے ہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ جو مثالیں دی گئیں، صوتی اثرات خود بخود ہی اس کیفیت کی طرف ذہن کو لے جاتے ہیں۔ اس میں ایک اہم نکتہ اور بھی ہے۔ اگر ان مثالوں پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ صوتی اثرات والے الفاظ کے بغیر بھی بات مکمل ہو سکتی ہے۔ مثلاً

"اچانک گولیاں برسنے لگیں"۔

اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے"۔

"گھنگھرو بجنے لگے"۔

"وہ نیچے آ گرا"۔

تمام جملے اپنے مخصوص حالات کو بیان کر رہے ہیں اور بخوبی بیان کر رہے ہیں۔ اب پہلے جملے کا تجزیہ کرتے ہیں۔

"اچانک گولیاں برسنے لگیں"۔ اپنی ساخت کے اعتبار سے ایک مکمل جملہ ہے، مگر "تڑاتڑ گولیاں" نے ایک ایسی کیفیت یا حالت کو اجاگر کیا، جس نے ایک خوفناک حد تک وحشت زدہ ماحول کی بھرپور عکاسی کر دی۔ ان امثال کا خلاصہ یہ ہوا کہ کلام میں زور اور اثر پیدا کرنے کے لئے موقع و محل کی مناسبت سے جن لفظیات کا انتخاب کیا جاتا ہے، وہ کسی واقعے، منظر، کیفیت یا حالت کی ہو بہو عکاسی میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں اور منظر نگاری کی حقیقی صورت گری کے لئے جو مخصوص لفظ جملے کے ساتھ جڑا ہوتا ہے اور کوئی آواز پیدا کر رہا ہوتا ہے، صوتی آہنگ قرار دیا جاتا ہے۔ نہ صرف نثر میں بلکہ شاعری میں بھی اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ صوتی اثرات سے اساتذۂ سخن نے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے اور کلام کے حُسن کو اس سے چار چاند لگائے ہیں۔

موسم ہو برسات کا، اور قلم ہو نظیر کے احساسات کا، تو دیکھئے کہ تصویر میں ساز بھی ہے اور آواز بھی۔

ہیں اس ہوا میں کیا کیا برسات کی بہاریں
سبزوں کی لہلہاہٹ باغات کی بہاریں
بوندوں کی جھماوٹ، قطرات کی بہاریں
ہر بات کے تماشے ہر گھات کی بہاریں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

لہلہاہٹ، جھماوٹ، وہ لفظیات ہیں جن میں لہلہاہٹ کے صرف تلفظ سے سبزے کی تازگی، اور جھماوٹ کی محض ادائگی سے بوندوں کے ٹپکنے کی آواز کانوں میں گونجنے لگتی ہے۔ اس پس منظر میں جب ہم جوش کی شاعری پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ جوش نے بھی اپنی شاعری میں صوتی اثرات سے بھر پور کام لیا ہے اور جہاں جہاں بات کی شدت کو واضح کیا ہے، وہاں وہاں صوتی اثرات کے لئے مخصوص لفظیات سے بھر پور طریقے سے کام لیا ہے۔ اس کی سب سے بیّن مثال ان کا مسدس "پانی" ہے، جس کا زیر نظر بند (17) صوتی لفظیات کی نادر مثال ہے۔ جوش کہتے ہیں:

ٹپ ٹپ شرر شرار تڑا تڑ چھنن چھنن
دھمال دھوم دھام دما دم دھنن دھنن
گم کاؤ روم جھوم جھما جھم جھنن جھنن
گھن گھن گرج گھماؤ گھما گھم گھنن گھنن
ہول و ہراس و ہیبت و ہیجاں لئے ہوئے
بجلی کی تیغ نوح کا طوفاں لئے ہوئے

بند کا پہلا مصرعہ کمال درجے کی فنکارانہ مہارت کو ظاہر کرتا ہے۔ اس مصرعے میں بارش کے

مختلف مراحل کو از ابتدا تا انتہا تغیر و تبدل کے تمام پہلوؤں کے ساتھ خوبصورت انداز میں نظم کیا گیا ہے۔ بند کے چاروں مصرعوں میں فعل یا متعلقات فعل کا کسی بھی جگہ کوئی استعمال نہیں کیا۔ گیا پانچواں مصرعہ "و" کی اضافت کے ساتھ بنایا گیا ہے اور تمام لفظیات ایک ہی حرف "ہ" سے بنائی گئی ہیں۔ مصرعۂ ثانی کے آخری ٹکڑے میں لفظ طوفان کا استعمال پورے بند کی فضا میں بے پناہ تاثر کا حامل نظر آتا ہے۔

یہ تو مصرعوں کی ساختیاتی اور لفظیاتی گفتگو تھی۔ اب مصرعوں کی کیفیاتی تصویر پر نظر ڈالتے ہیں۔ بارش کی ابتدا بوندا باندی سے ہوتی ہے۔ اس کے لئے جوش نے "ٹپ ٹپ" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جب بارش میں کچھ تیزی آتی ہے تو اس کی صوتی صورت گری کے لئے "شرر شرار" کی لفظیات لائی گئی ہیں۔ یہ وہی "شرر شرار" ہے کہ جب بارش ہوتی ہے تو اس میں ہوا کی ہلکی آواز بھی شامل ہو جاتی ہے، جس کو "شرر شرار" کہا گیا ہے۔ اب اور آگے بڑھتے ہیں۔ بارش کی رفتار تیز ہو رہی ہے۔ ہر جا پانی ہی پانی برس رہا ہے۔ اس کے لئے لفظ "تڑاتڑ" بہت موزوں ہے۔ جس طرح پھوار برستی ہے تو اس کے لئے "رم جھم" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی طرح جب بارش قوت کے ساتھ اور مسلسل ہو رہی ہو تو ذہن میں "تڑاتڑ" گونجنے لگتا ہے۔ اب تک مصرعہ "ٹپ ٹپ، شرر شرار، تڑاتڑ" تک آیا ہے۔ بارش اب اپنے اختتامی مراحل میں داخل ہو رہی ہے۔ بارش کی تیزی، اس میں ہوا کی تیزی، دونوں مل کر بارش کی سمت کھو دیتے ہیں۔ یعنی ایک ملی جلی کیفیت ہے۔ اس کیفیت کو محسوس کر کے شاعر موسم کی خوبصورتی سے لطف اندوز ہوتا ہے اور ذہن Romanticism کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور بے ساختہ "چھنن چھنن" کی آواز کانوں میں رس گھولنے لگتی ہے۔ اب مصرعہ کامل ہو گیا۔

"ٹپ ٹپ، شرر شرار، تڑاتڑ، چھنن چھنن"

جوش کے مجموعۂ کلام "شعلہ و شبنم" میں ایک نظم ہے، جس کا عنوان ہے، "ناخدا کہاں ہے"۔ (ص ۴۷)۔ اس نظم میں جوش نے ماحول کے پیش نظر صوتی اثرات سے کام لے کر نظم کو رواں

رواں اور مترنم بنایا ہے۔

فضا کچھ یوں ہے کہ بارش ہو رہی ہے، جس سے سمندر میں طوفان اٹھ رہا ہے۔ ایک کشتی دریا میں رواں دواں ہے، مگر کشتی کا ملاح یعنی "ناخدا" موجود نہیں ہے۔ اس تمام منظر نامے کی عکاسی کرنے کے لئے جوش نے جن لفظیات کا استعمال کیا ہے وہ صورتحال کا نقشہ کھینچنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں گفتگو کی نوعیت کے پیش نظر مذکورہ نظم کے بند ۴ اور ۵ پیش کئے جاتے ہیں۔

بھرا ہوا غیظ میں سمندر، فضا کی جانب ہمک رہا ہے
گرج کڑک ہے کڑک چمک ہے، چمک ہوا ہے، ہوا گھٹا ہے
چھنن چھنن ہے، گھڑ گھڑ ہے، گھنن گھنن ہے، دنا دنا ہے
فلک کے ہونٹوں پر الحذر ہے، زمیں کے لب پر، الاماں ہے
کوئی خدا کے لئے بتاؤ، کہ ناخدا کون ہے، کہاں ہے

سمندر جوش میں ہے۔ اس کی تند و تیز لہروں کو دیکھ کر ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ وہ آسمان پر چڑھنا چاہتا ہے۔ جوش نے سرکشی کے لئے "ہمک" کا لفظ استعمال کیا ہے، جس میں بے ساختگی ہے۔ مصرعے میں "ہمک" کی جگہ "لپک" بھی استعمال کیا جا سکتا تھا، مگر "ہمک" میں ضد کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ جوش سمندر کی کیفیت کو نظر میں رکھ کر "ہمک" کا لفظ استعمال کر رہے ہیں۔ جب بچہ کسی اچھی چیز کو دیکھتا ہے، تو وہ اس کو لینے کے لئے ہمکنے لگتا ہے اور یہی کیفیت اس وقت سمندر کی ہے۔ بادل گرج رہے ہیں اور آواز میں کڑک ہے۔ کڑک سے چمک پیدا ہو رہی ہے۔ چمک ہوا میں شامل ہو رہی ہے اور ہوا گھٹا بن کر برس رہی ہے۔ ہوا کا چلنا، بادل کا گرجنا، بجلی کا چمکنا اور گھٹا کا برسنا، ان سب کی عکاسی کے لئے تیسرا مصرعہ لفظیاتی لکھا گیا ہے اور موسم کی شدت واضح کرنے کے لئے صوتی آہنگ کا استعمال کیا گیا ہے۔

ڈراؤنی رات رو رہی ہے، بھرے ہوئے ہیں، تمام جل تھل
بھنور نکالے ہوئے ہیں آنکھیں، جھکے ہوئے ہیں، سیاہ بادل

ہوا میں شورش، گھٹا میں غوغا، فضا میں لرزش، زمیں پہ ہلچل
تمام گیتی ہے پارہ پارہ ،تمام گردوں ،دھواں دھواں ہے
کوئی خدا کے لئے بتاؤ ،کہ ناخدا کون ہے ،کہاں ہے

بند کے تیسرے مصرعے میں آوازوں کا استعمال ہے اور اگر اس مصرعے کو تکرار کے ساتھ پڑھا جائے ،تو اس میں نغمگی کا تاثر ابھرتا ہے۔ چوتھا مصرعہ

تمام گیتی ہے پارہ پارہ ،تمام گردوں ،دھواں دھواں ہے

اگر مصرعے میں "پارہ پارہ" کی جگہ "پانی پانی" استعمال کیا جاتا، تو صورت حال آئینے کی طرح واضح ہو جاتی۔ مگر جوش نے ماحول کو "ابر آلود اور آب نما" دکھایا ہے، اس لئے "پانی" کے لفظ سے قصداً اجتناب کیا ہے۔ لہٰذا

تمام گیتی ہے پارہ پارہ ،تمام گردوں ،دھواں دھواں ہے

سے تصویر کی جو صورت اذہان میں ابھرتی ہے، وہ یہ ہے کہ مسلسل بارش سے ہر جگہ پانی ہی پانی ہے اور آسمان سے تواتر کے ساتھ بارش ہونے کے باعث آسمان پر دھواں چھا گیا ہے۔
جوش کے شعری مجموعے، "سموم و صبا" میں ایک نظم، بہ عنوان "رم جھم" موجود ہے۔ نام سے ہی ظاہر ہے کہ نظم میں موسیقی و نغمگی کی کیفیت پائی جاتی ہوگی اور جوش نے واقعتاً اس نظم کو لفظیات کے استعمال سے متحرک کیا ہے۔ اور نظم کے جو بند بطور خاص، ترنم اور نغمگی کی کیفیت لئے ہوئے ہیں، وہ بند ایک، دو اور نو ہیں۔ جن کے پڑھنے سے صوتی اثرات نمایاں ہوتے ہیں۔ پہلے بند میں کہتے ہیں

سنکتے جھونکوں میں زندگانی بھنکتی بوندوں میں، دل ستانی
زمین طوفانِ شادمانی، تو آسماں، سیلِ کامرانی

چمک رہے ہیں، رواں فسانے، گرج رہی ہے، رواں کہانی

شراب، کھلتا ہوا شگوفہ، شباب، کھلتی ہوئی کمانی

فلک غزل خواں، فضا پَرْ افشاں، ہوا خروشاں، گھٹا دُخانی

اٹھو، کہ رم جھم، برس برس کر، بجا رہا ہے ستار پانی

بجا رہا ہے ستار پانی، بجا رہا ہے ستار پانی

اٹھو، کہ رم جھم، برس برس کر، بجا رہا ہے ستار پانی

نظم کا مرکزی مصرعہ، جس کے محور پر یہ نظم گھوم رہی ہے۔

''اٹھو، کہ رم جھم، برس برس کر بجا رہا ہے ستار پانی''

اپنے اظہار میں اتنا رواں اور مترنم ہے کہ اسے بہ تکرار پڑھتے ہوئے لطف محسوس ہوتا ہے۔ مصرعہ تین کو، چار سے ملا کر پڑھنے سے، خوب صورت صوتی تاثر محسوس ہوتا ہے۔

جوشؔ کے مجموعہ کلام، ''سرود خروش'' میں ایک طویل نظم، ''ماتمِ آزادی'' کے عنوان سے ہے۔ نظم مسدس کی ہیئت میں کہی گئی ہے۔ اس نظم کا اکتالیسواں بند اپنی ساختی ترکیب کے اعتبار سے بے حد موثر ہے۔ بند کے چاروں مصرعے اپنی اکائی کی صورت میں یکساں حروف سے شروع ہوتے ہیں۔ اس کو Alteration یا صنعت تجنیس بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس بند میں لفظیات کے اجزائے ترکیبی حسین اور متوازن بنا کر خوب صورت صوتی تاثر پیدا کیا گیا ہے۔

سرو سہی، نہ ساز، نہ سنبل، نہ سبزہ زار

بلبل، نہ باغباں، نہ بہاراں، نہ برگ و بار

جیجوں، نہ جامِ جم، نہ جوانی، نہ جوئے بار

گلشن، نہ گل بدن، نہ گلابی، نہ گل عذار

اب بوئے گل، نہ بادِ صبا مانگتے ہیں لوگ

وہ حبس ہے، کہ لُو کی دعا مانگتے ہیں لوگ

چاروں مصرعے لفظیاتی ہیں۔ محض دو جگہ اضافتوں کا استعمال ہے۔ چاروں مصرعوں میں لفظیات کی ترتیب کو خاص پیرایہ دے کر بند کو رواں بنایا گیا ہے۔ مذکورہ نظم کا ۴۴واں بند بھی قابل مطالعہ و ملاحظہ ہے۔

وہ تازہ انقلاب ہوا، آگ پہ سوار
وہ سنسنائی آنچ، وہ اڑنے لگے شرار
وہ گم ہوئے پہاڑ، وہ غلطاں ہوا غبار
اے بے خبر، وہ آگ لگی آگ، ہوشیار
بڑھتا ہوا، فضا پہ قدم مارتا ہوا
بھونچال آ رہا ہے، وہ پھنکارتا ہوا

لفظ "وہ" سے مصرعوں کو تصوراتی پیکر عطا کیا گیا ہے۔ پورے بند میں سات جگہ "وہ" کا استعمال کیا گیا ہے۔ اگر ان مصرعوں کو بہ تکرار پڑھا جائے، تو ایک خوب صورت صوتی تاثر پیدا ہوتا ہے۔ "بے خبر" کہہ کر "آگ" لگنے کی اطلاع دینا، اور پھر "ہوشیار کرنا"، نہایت تیزی سے ابتدا تا انتہا اپنا سفر طے کرتا ہے۔ اسی کے ساتھ "بھونچال کا پھنکارتے ہوئے آنا" بھی اس کی دہشت و ہیبت اور دبدبے کو ظاہر کرتا ہے۔ "بھونچال" کے تصور ہی سے شدید ترین ابتری اور وحشت زدگی کا منظر نظروں میں پھرنے لگتا ہے۔

ان امثال سے یہ بات واضح ہو گئی کہ جوش لفظ سے آواز کو دکھانے کا خاص ملکہ رکھتے ہیں، اور یہ وصف، گنتی کے چند شعراء کو حاصل ہے اور یہ بات کہنے میں کوئی مبالغہ نہیں کہ اس خصوصیت میں جوش کا کوئی مد مقابل نہیں۔

روزنامہ جنگ اور جوشؔ ملیح آبادی

10 دسمبر 1955 کو روزنامہ جنگ کراچی نے صفحہ اوّل پر ایک خبر شائع کی، جس کے مطابق "جوشؔ ملیح آبادی اردو کو پاکستان کی قومی زبان بنانے میں اپنا کردار ادا کریں گے۔" یہ خبر بابائے اردو کے ایک بیان پر مبنی تھی۔ خبر کی تفصیل میں بتایا گیا تھا:

"ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے کہا ہے کہ کراچی میں جوشؔ ملیح آبادی کی موجودگی پاکستان میں اردو شاعری میں نئی روح ڈالنے کا باعث ہوگی۔ ڈاکٹر عبدالحق نے توقع ظاہر کی ہے کہ جوشؔ ملیح آبادی اردو کو پاکستان کی واحد قومی زبان تسلیم کرانے کی جدوجہد میں اہم کردار ادا کریں گے۔"

اُلفتِ اردو میں سرتاپا گرفتار بابائے اُردو کو جب اُردو کے نابغہ روزگار شاعر، جوشؔ ملیح آبادی کی کراچی آمد کی اطلاع ملی تو وہ اس بات پر بے حد شاداں و فرحاں ہوئے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جوشؔ اردو شاعری کا ہمیشہ تابندہ رہنے والا ستارہ ہیں اور جوشؔ کی اردو زبان پر مہارت اور اُس کے لیے کی گئی خدمت پاکستان اور اہلِ پاکستان کے لیے فالِ نیک ثابت ہوگی۔ جوشؔ نے پاکستان آنے کے بعد ادبی تخلیقات و نگارشات کا سلسلہ جاری رکھا۔ 18 فروری 1957 کی اشاعت میں اُس زمانے کے اخبار "امروز" نے جوشؔ کے ایک مسدّس طلوعِ فکر پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا:

"ہمیں توقع ہے کہ جوشؔ کی شعری تخلیق کا سلسلہ جاری رہے گا اور ان کی اور بھی چیزیں منظرِ عام پر آتی رہیں گی۔ انہوں نے اردو ادب کو بہت کچھ دیا ہے لیکن گیسوئے اردو ابھی اُن کی مشاطگی کے محتاج ہیں۔"

روزنامہ جنگ کے بانی میر خلیل الرحمان کی صحافیانہ خدمات کے دوش بدوش ادبی خدمات بھی طویل تذکرے کی متقاضی ہیں۔ ادب سے براہِ راست تعلق نہ رکھنے کے باوجود انہوں نے روزنامہ جنگ میں بالکل ابتدائی وقت سے صفِ اوّل کے ادبی فنکاروں کی تحریری نگارشات سے اخبار کے اعتبار اور وقار کو چار چاند لگا دیا اور قارئین برصغیر کے بے مثل ادبی ستاروں کے احساسات اور خیالات سے اخبار کے ذریعے واقف رہنے لگے۔ اپنے وقت کے نامور شعراء اور ادیبوں کو اخبار سے وابستہ کرنے کے لیے میر خلیل الرحمان غیر معمولی ذہانت سے کام لیتے۔ وہ کسی شاعر یا ادیب کو جب اخبار سے منسلک کرتے تو اُس کی شخصیت کے عین مطابق اخبار میں پہلے سے اُس کی آمد کی اطلاع بطور اشتہار یا خبر شائع کرتے۔ چنانچہ جب جوشؔ ملیح آبادی اخبار سے وابستہ ہوئے تو اخبار میں اُن کی آمد کی اطلاع قارئین کو قبل از وقت دے دی گئی۔

میر خلیل الرحمان تقسیمِ ہند کا پُر آشوب دور اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے، لہٰذا انہیں جوشؔ اور کلامِ جوشؔ سے بخوبی آشنائی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ متحدہ ہندوستان میں جب آزادی کی تحریک چلی تو جو آواز سب سے توانا اور فرنگیوں کی نظر میں مجرمانہ تھی، وہ جوشؔ کی آواز کی تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ غلام ہندوستان میں لوگوں کے دلوں میں آزادی کا شرارہ پیدا کرنے والا، جبر و بیداد اور استبداد کے خلاف آواز بلند کرنے والا، حُریت فکر کو پروان چڑھانے والا اور جراتِ اظہار کا علم اٹھانے والا جوشؔ نتیجے سے بے پروا اور سزا سے بے نیاز اپنے کام میں مشغول رہتا تھا اور کام تھا وطن پرستانہ انقلابی خیالات پر مبنی نظمیں۔

چنانچہ جب جوشؔ ترکِ وطن کر کے پچاس کے عشرے میں پاکستان آئے تو کچھ وقت کے بعد ہی سے یہ کوششیں شروع ہو گئیں کہ انہیں اخبار سے وابستہ کیا جائے۔ تاہم کچھ نہ کچھ رکاوٹیں پیش آتی رہیں۔ وقت گزرتا رہا، یہاں تک کہ ساٹھ کا عشرہ شروع ہو گیا۔ باسٹھ وہ سال تھا جب جوشؔ روزنامہ جنگ کراچی کے لیے قلمی تعاون پر آمادہ ہوئے۔ جوشؔ یکم اکتوبر 1962 کو روزنامہ جنگ کراچی سے وابستہ ہوئے۔ اس مناسبت سے روزنامہ جنگ کراچی میں 30 ستمبر 1962 کو صفحۂ اوّل پر اخبار کے اوپری حصے میں جوشؔ کی تصویر کے ساتھ باکس میں حسبِ ذیل اعلان شائع کیا گیا:

''اخبار جنگ سے شاعر انقلاب کی وابستگی''

''ہم بڑی مسرت کے ساتھ یہ اعلان کرتے ہیں کہ شاعر انقلاب حضرت جوشؔ ملیح آبادی نے ادارہ جنگ میں شامل ہونا منظور کر لیا ہے۔ حضرت جوشؔ اب ہر ''ہفتہ'' جنگ میں اپنے خیالات کا اظہار کریں گے۔ اُن کا پہلا کالم کل کے سنڈے ایڈیشن میں شائع ہوگا۔''

یوں یکم اکتوبر 1962 کو جوشؔ نے روزنامہ جنگ کراچی کے لیے تحریری نگارشات کا سلسلہ شروع کیا۔ جوشؔ کے سلسلہ مضامین ''علم وفکر'' کے عنوان سے روزنامہ جنگ کی زینت بنتے رہے۔ قابل غور امر یہ ہے کہ اخبار کے لیے کالم کا عنوان جوشؔ کے شعری مجموعہ ہائے کلام کی طرز پر تجویز کیا گیا۔ مثال کے طور پر جوشؔ کے چند شعری مجموعوں کے نام یہ ہیں۔ ''نقش ونگار''؛ ''الہام وافکار''؛ ''شعلہ وشبنم''؛ ''آیات ونغمات''؛ ''رامش ورنگ''۔ ان ناموں کو نظر میں رکھتے ہوئے ''علم وفکر'' کا عنوان انتہائی موزوں نظر آتا ہے۔

یکم اکتوبر 1962 سے شروع ہونے والا ''علم وفکر'' پر مبنی یہ تحریری سلسلہ 1965 تک مختلف ذیلی عنوانات کے ساتھ قارئین کی ذہنی سطح کو بالیدگی اور بلندی فکر عطا کرتا رہا۔ اس پورے عرصے میں جوشؔ نے اپنے کالم میں افکار کے اظہار کے لیے کبھی نثر اور کبھی نظم کا سہارا لیا۔ نظم میں بھی کبھی رباعیات، کبھی غزل اور کبھی مجرد نظم کا چناؤ کیا۔ یکم اکتوبر 1962 کو اخبار میں جوشؔ کا پہلا کالم شائع ہوا۔ اخبار نے کالم کے ساتھ ایک تعارفی تحریر بھی درج کی، جس میں قارئین کو بتایا گیا:

''شاعر انقلاب حضرت جوشؔ ملیح آبادی مدیر ''اردو لغت'' ومشیر ترقی اردو بورڈ نے ''جنگ'' سے تحریری تعاون کرنا منظور کر لیا ہے۔ وہ ہر ہفتہ ''جنگ'' کے کالموں میں اپنے خیالات کا اظہار کریں گے۔ ذیل میں اُن کا پہلا کلام قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔'' (ادارہ)

جوشؔ نے اس کالم میں ویسے ہی طرزِ فکر سے کام لیا جو اُن سے منسوب و مخصوص تھا۔ انہوں نے آغازِ گفتگو میں کہا:

"قیامت تک پھول برسیں اُس خسروِ علم کے مزار پر جس نے علم شے بہ از جہلِ شے کا مقولہ عطا کر کے نوعِ انسانی کو صراطِ مستقیم دکھائی تھی۔ علم شے کے پردے میں اُس محسنِ انسانیت نے اس امر کی جانب اشارہ کیا تھا کہ صرف عظیم و اہم چیزوں ہی کا علم ضروری نہیں بلکہ اُن چیزوں کا علم حاصل کرنا بھی ہمارے فرائض میں داخل ہے جو بظاہر سبک و حقیر نظر آتی ہیں۔ مثال کے طور پر کسی سڑک کے موڑ والے کھانچے، اور کسی گلی کے نکڑ کے دواخانے پر نظر ڈالیے۔ بظاہر یہ دونوں چیزیں کس قدر ناقابلِ اعتناء معلوم ہوتی ہیں، لیکن بسا اوقات، سڑک کے کھانچے کا اگر پہلے سے علم ہو جائے تو ہماری موٹر الٹ جانے سے محفوظ رہ سکتی ہے۔ اور بعض اوقات، چوبیس گھنٹے کھلی رہنے والی دوا فروش کی دکان کا علم ہماری آدھی رات کے بیمار پڑ جانے والے بچے کو، عین وقت پر دوا پہنچا کر اس کی جان بچا سکتا ہے۔ اس لیے اس حقیقت کو فراموش نہ کرنا چاہیے کہ ہر "امرِ معلوم" ایک منبعِ خیر اور ہر "امرِ نامعلوم" ایک علتِ شر ہوا کرتا ہے۔

۔۔۔بات یہ ہے کہ خود ہمارا وجود ایک تشنگی ہے، جب تک ہم کو علم کا آبِ شیریں میسّر نہیں آئے گا، ایک ابدی تشنگی ہمارا احاطہ کیے رہے گی۔ ہم گھٹا ٹوپ تیرگی سے کیوں ڈرتے ہیں؟ اس لیے کہ تیرگی میں ہم کو اپنے گرد و پیش کی کسی چیز کا علم نہیں ہوتا۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ ہم نفسِ تیرگی سے نہیں، جہل سے خوف کھاتے ہیں۔ اور یہ خوفِ جہل اس امر کی روشن ترین دلیل ہے کہ ہم طبعاً جہل بیزار اور علم دوست واقع ہوئے ہیں۔ ہر چند اس امر میں شک کرنا کہ علم ایک دولتِ بیدار ہے، کفر سے بھی گری ہوئی بات ہے، لیکن اس حقیقتِ کبریٰ کو کبھی نہ بھولنا چاہیے کہ تنہا آگاہی اور مجرد علم سے انسان کو فروغ حاصل نہیں ہوا کرتا، اور جب تک کہ علم کی پشت پر تفکّر کو سوار نہیں کیا جاتا، انسان اپنی منزلِ مقصود پر نہیں پہنچ سکتا۔

ایک عمر میں ہوتی ہے بصیرت پیدا
ہوتی ہے بہت شاذ یہ دولت پیدا
رگ رگ میں اتر جائے تفکر نہ اگر
خود علم سے ہوتی ہے جہالت پیدا

علم، اشیائے معلوم کا ایک بے ڈھنگا انبار، یا یوں سمجھ لیجیے کہ ایک کباڑ خانہ ہوتا ہے جہاں تمام سامان الجھا سلجھا، اوپر تلے پڑا ہوتا ہے۔ یہ فکر و تعقل ہے جو اس کباڑ خانے میں داخل ہو کر تمام بکھرے سامان کو اکٹھا کرتا، ایک ایک چیز کو جانچتا، پرکھتا، ٹٹولتا، کھولتا، اور تولتا ہے۔ اُن کے جوڑ بند، اُن کے آب و روغن، اُن کی ہیئت و ساخت، اور اُن کی افادیت کو معلوم کرتا ہے اور دو "معلوم" چیزوں کے تمام پہلوؤں کو، الٹ پلٹ کر کے، ایک تیسری "نامعلوم" چیز کو کھود کر نکالتا ہے اور آخر کار اس کباڑ خانے کو کارگاہِ جواہر میں تبدیل کر کے، جگ مگا دیتا ہے۔"

21 اپریل 1964 کو "علم و فکر" کا ذیلی عنوان تھا "حضرت رئیس امروہوی"۔ اس کالم میں جوش نے رئیس کی شخصیت و فن پر اپنے مخصوص اندازِ تحریر سے کام لیا۔ اس کالم کا ایک اقتباس ذیل میں دیا جاتا ہے۔

"رئیس کی یہ چوتھی خصوصیت ایسی ہے جس نے اُن کو ایک زبردست شاعر منوا کر دم لیا ہے، اور خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے عشق و جنون کی اس پُر شور منڈی میں جہاں قلندرانِ عالم اپنے اپنے کرتب دکھا رہے ہیں، درسِ عقل و فکر تبلیغ کا نعرہ بلند کیا ہے۔ اس چار پانچ سو سال کی پرانی منڈی میں جہاں سقراط کو زہر کا پیالہ پلا دیا گیا اور عیسیٰ کو صلیب پر چڑھا دیا گیا تھا، عقل و فکر کی تبلیغ کرنا کس قدر خطرناک کام ہے۔ رئیس قابلِ مبارک باد ہیں کہ انہوں نے سر سے کفن باندھ کر اس جان لیوا کوچے میں قدم رکھا ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شعر کے جوہر کے ساتھ ساتھ قدرت نے اُن کے سینے

میں شیر کا دل بھی رکھ دیا ہے۔اب میں آخر میں اُن کا ایک انوکھا،اور حقائق در آغوش شعر نقل کر کے،اپنے اس قلم برداشتہ دوسرے مضمون کو ختم کرتا ہوں۔شعر ہے:

شاید اُسے عشق بھی نہ سمجھے
جس کرب میں عقل مبتلا ہے

اس شعر کا سمجھنا اور سمجھ کر اس کی داد دینا آسان کام نہیں ہے۔اس لیے کہ ہم نامراد اربابِ ایشیا کی گھٹی میں عشق اور اس کا پیدا کردہ جنون پڑا ہوا ہے۔اور اس وجہ سے ہم عقل سے نفرت کرتے اور اس کو ایک شیطانی وسوسہ سمجھ کر اس سے اس طرح کتراتے ہیں جیسے شکاری کی صورت دیکھ کر ہرن بھاگنا شروع کر دیتے ہیں۔کس سے کہا اور کس کو سمجھایا جائے کہ بادۂ عشق میں لاکھوں مصیبتیں سہی،لیکن عقل پر وہ بلائیں نازل ہوتی ہیں کہ اُن کے روبرو مصائبِ عشق پانی بھرتے نظر آتے ہیں۔اور کس سے کہا جائے کہ اس حدیث پر بھی غور کرو کہ ایک لمحے کا تفکر ہزاروں جہادوں پر بھاری ہوتا ہے۔اگر میرا تمام کلام لے کر رئیس اپنا یہ شعر مجھے دے دیں تو میں اپنے کو قارونِ زماں سمجھنے اور ہمائے اوجِ سعادت بدام ما افتاد کے نعرے لگانے لگوں۔"

جونؔ ایلیا

بے قرار طبیعت اور بولتے مصرعوں کا شاعر

(جونؔ ایلیا کا شمار پاکستان کے اُن معتبر شعرا میں ہوتا ہے، جن کو عالمی سطح پر بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا، اُن کے بیشتر اشعار، زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ جونؔ ایلیا کا تعلق "امروہہ" کے علمی، ادبی اور تہذیبی خانوادے سے تھا۔ اُن کے والد، علامہ شفیق ایلیاؔ اردو، عربی، فارسی اور عبرانی زبانوں کے قادر الکلام شاعر تھے۔ بھائی رئیس امروہوی اور سید محمد تقی کو کون نہیں جانتا۔ جونؔ ایلیا نے اپنے زمانے میں شاعری کے حوالے سے جو شہرت و مقبولیت حاصل کی، وہ بہت کم لوگوں کا مقدر رہی۔ اُن کی شاعری کے حوالے سے ڈاکٹر قمر عباس کا ایک مضمون پیشِ خدمت ہے۔ ادارہ و جنگ)

" یہ مجھے چین کیوں نہیں پڑتا "

یہ مصرع عہدِ جدید کے غزل گو اور صاحبِ اسلوب و محبوب شاعر، جونؔ ایلیا کا ہے اور اُن کے ہزار ہا مصرعوں میں سے اس مصرعے کو منتخب کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ مصرع شاعر کی ازاوّل تا آخر ذہنی کیفیت کا مکمل غماز ہے۔ ایک متجسس اور بے چین جونؔ، ایک سادہ اور پُر پیچ جونؔ، ایک بے قراری کا مُرقّع اور بے یقینی سے مُرصّع جونؔ۔

تو یہی جونؔ ایلیا 14 دسمبر 1931 کو غیر منقسم ہندوستان کی علم و دانش سے پُر ریاست کے مردم خیز ضلع، امروہہ میں اُس گھرانے میں پیدا ہوئے، جس کو پورے ضلع میں عزت و احترام حاصل تھا۔ علم و ادب اور شعر و شاعری گویا پشتوں سے پیشۂ آباء ٹھہری تھی۔ پَر دادا سیّد امیر حسن

امیر اُردو اور فارسی میں شعر کہنے کے علاوہ صاحبِ طرز نثر نگار بھی تھے۔ دادا سید نصیر حسن نصیر بھی شاعر تھے۔ جونؔ کے والد، سید شفیق حسن ایلیا مخزنِ علوم تھے۔ مختلف زبانوں پر مہارت کے علاوہ علمِ ہیئت اُن کی خاص جولانگاہ تھا۔ اپنے تبحرِ علمی کے سبب انگلستان کے فلاسفرز بشمول برٹرینڈ رسل سے خط و کتابت میں مصروف رہتے تھے۔ جونؔ کے سب سے بڑے بھائی، رئیس امروہوی جونؔ کی پیدائش کے وقت ادب اور صحافت میں معتبر حیثیت حاصل کر چکے تھے۔ منجھلے بھائی سید محمد تقی فلسفے کی دنیا کو کھنگالنے اور وہاں سے علم و حکمت کے موتی نکالنے میں مصروف تھے۔ منجھلے بھائی سید محمد عباس اشتراکی سوچ اور نظریات پر کاربند تھے۔ تو یہ وہ علمی و کتابی پس منظر تھا، جو جونؔ کو ازبر تھا۔ شعور کی عمر سے پیشتر ہی جونؔ علمی صحبتوں اور فکری مکالموں سے آشنائی حاصل کر چکے تھے۔ گھریلو فضا طلوعِ آفتاب سے ماہتاب کی کرنیں ڈھلنے تک مباحثِ تاریخِ عالم، مباحثِ تاریخ، مباحثِ علمِ ہیئت، مباحثِ فلسفہ اور مباحثِ شعر و شاعری سے مملو رہتیں۔ بقول جونؔ "عطارد، مریخ، زہرہ اور مشتری وغیرہ کا ہمارے گھر میں اتنا ذکر ہوتا تھا، جیسے یہ سیارے ہمارے افرادِ خانہ میں شامل ہوں"۔ عمر کی آٹھویں منزل تھی کہ علم سے مات کھائے جونؔ، عشق کی چوٹ بھی لگا بیٹھے اور نتیجے کے طور پر پہلا شعر کہا

چاہ میں اُس کی طمانچے کھائے ہیں
دیکھ لو، سُرخی مرے رُخسار کی

اُس کم عمری میں علم اور عشق کے ساتھ، جس چیز نے مزاج میں آتش بھر دی، وہ انگریزوں کا سرزمینِ ہند پر قابض ہونا تھا اور اُس نفرت کے اظہار کے طور پر جونؔ خیالی محبوبہ، صوفیہ کو خطوط لکھا کرتے، جس میں انگریزوں کو سرزمینِ ہند سے نکالنے کے منصوبے سوچے جاتے۔ جہاں تک تربیت کا معاملہ تھا، وہ تو بزرگانِ علم و ادب کے زیرِ سایہ جاری تھی اور جب تعلیم کی منزل آئی تو امروہہ کے سید المدارس سے عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ سنسکرت اور عبرانی خصوصی شغف کا موضوع قرار پائے اور انگریزی میں بھی استعداد حاصل کی۔ اس طرح تعلیم و تربیت کی منزل سر

ہونے لگی۔ وقت کچھ آگے بڑھا اور تقسیم ہند کی تحریک تیز تر ہو گئی۔ مسلم لیگ، قائداعظم کی زیرِ قیادت مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت بن کر سامنے آ گئی۔ جونؔ کے دونوں بڑے بھائی رئیس امروہوی اور سید محمد تقی کانگریس سے ناتا توڑ کر مسلم لیگ کے جھنڈے تلے آ گئے۔ یہ سارا ہنگامہ خیز دور جونؔ کے لئے سیکھنے کا ایک بھرپور عمل تھا۔ سیاسی، مذہبی، ادبی اور سماجی شخصیات کے خیالات، اُن سے ملاقات، گرد و پیش کے حالات اور واقعات، غرض سلسلۂ روز و شب زندگی میں غضب ڈھانے پر آمادہ تھے۔ اُن ہی دنوں جونؔ نے ''بزمِ حق نما'' کے نام سے ایک ڈراما کلب بھی قائم کیا، جس میں پیش کیے جانے والے ڈرامے اسلامی تاریخ سے تعلق رکھتے تھے۔ جونؔ ڈراموں میں مرکزی کردار ادا کرتے تھے۔ ''خونی خنجر'' کے نام سے ایک ڈراما خود جونؔ نے بھی تحریر کیا۔ محلّے سے باہر جونؔ اب ایک اداکار کی حیثیت سے پہچانے جانے لگے۔ 1943 سے 1946 تک کا عرصہ جونؔ نے ڈراما کمپنی کی سنگت میں گزارا۔

برصغیر میں 1946 کے فیصلہ کن انتخابات نے مسلم لیگ اور کانگریس کو کانٹے دار مقابلے کے لئے آمنے سامنے لا کھڑا کیا اور پوری قوم ایک کہانی اور ڈرامے کا کردار بن گئی۔ ایسی کہانی اور ایسا ڈراما، جس کے سامنے جونؔ کا ڈراما کلب ماند پڑ گیا۔ برصغیر کی تقسیم عمل میں آ گئی۔ ایک عہد تمام ہوا اور ایک نیا عہد شروع ہوا۔ جونؔ کے دونوں بڑے بھائی رئیس امروہوی اور سید محمد تقی، جو جونؔ کے لئے بالترتیب مُعلّمِ اوّل اور مُعلّمِ ثانی کا درجہ رکھتے تھے، پاکستان ہجرت کر گئے۔ اب جونؔ، مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن امروہہ کے صدر نازش امروہوی کے ساتھ وقت گزارنے لگے۔ نازش ایک روشن خیال انسان تھے اور زندگی کے عملی نظریات کے اطلاق کے لئے بائیں بازو کی سیاست پر یقین رکھتے تھے۔ خود وہ ممتاز ادیب اور استاد، پروفیسر اعجاز حسین کی کتاب ''نئے ادبی رجحانات'' سے بے انتہا متاثر تھے۔ یہ کتاب اس حد تک مقبول ہوئی کہ 1942 کے ہنگامہ خیز برصغیر میں محض چھ ماہ کے اندر کتاب کا پہلا ایڈیشن ختم ہوا اور اُسی پُر آشوب دور میں دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ پروفیسر اعجاز حسین کی شخصیت کے لئے اتنا ہی بیان کرنا کافی ہے کہ وہ پروفیسر احتشام حسین جیسے نقّاد کے استاد رہے تھے۔ اُن کے نمایاں شاگردوں میں ابنِ صفی بھی شامل تھے۔ جونؔ

بھی اس کتاب کے استفادہ کنندگان میں شامل تھے۔ اب جونؔ فلسفہ و منطق اور کمیونزم کی سمت آئے۔ برطانوی، اسکاٹش، یونانی، جرمن اور عرب فلسفہ دانوں کے خیالات کا مطالعہ جونؔ کے ایام روز و شب کا ایک مسلسل قصہ اور حصہ بن کر رہ گیا۔ یہ فلسفیانہ مشاغل جونؔ کی شب بیداری، اختر شماری اور بے قراری کے لمحات کو طویل تر بناتے چلے گئے اور کیفیت یہ ہو چلی۔

میرے سینے میں بجھ رہا ہے وجود
اور دل میں سوال سا کچھ ہے

وقت مجھ کو نہ چھین لے مجھ سے
سر خوشی میں ملال سا کچھ ہے

جو گزاری نہ جا سکی، ہم سے
ہم نے، وہ زندگی گزاری ہے

رائیگانی ہے زندگی میری
میں تو خود میں بھی رائیگاں ہی گیا

میں ہوں بھی یا نہیں ہوں، عجب ہے مرا عذاب
ہر لمحہ "یا" کے ساتھ ہوں، تم کس کے ساتھ ہو

لفظ سے مصرع، مصرعے سے شعر اور شعر سے غزل خوب سے خوب تر کا سفر طے کر رہی تھی

کوئی حالت نہیں، یہ حالت ہے
یہ تو آشوب ناک صورت ہے

تجھ سے یہ گاہ گاہ کا شکوہ
جب تلک ہے، بسا غنیمت ہے

ہیں دلیل ترے خلاف، مگر
سوچتا ہوں، تری حمایت میں

1957ء میں جونؔ، پاکستان چلے آئے اور ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ کراچی کی فضا اُس وقت علم وادب کے لئے خاصی سازگار تھی۔ جونؔ نے مشاعروں میں حصہ لینا شروع کیا اور اپنے مخصوص اندازِ تکلم سے جلد ہی شناخت بنالی۔ نہ صرف یہ کہ شناخت ہی بنائی، بلکہ اپنا لہجہ بھی تراش لیا اور صاحب اسلوب شاعر کے طور پر تسلیم کئے جانے لگے۔ فلسفہ، منطق، اسلامی تاریخ، مسلمان صوفیاء کی تاریخ، مذاہب کا تقابلی مطالعہ، مغربی ادب، جودھ ازم میں تصوف کا رنگ، جیسے موضوعات پر گہری نظر رکھنے والے جونؔ نے شاعری میں گاہے گاہے اسے برتنے کا انتظام بہت سلیقے سے کیا اور اس عنوان سے وہ معاصر شعراء میں الگ نظر آنے لگے۔ جب تراجم کی طرف نگاہ کی تو اُس میں بھی کمالِ علم وفن دکھایا۔ مسیح بغداد حلاج، حسن بن صباح، اسلام میں اسماعیلی فرقہ اور دیگر اہم تراجم پیش کئے۔ جونؔ نے ”انشاء“ کے نام سے جاری ادبی رسالے کے لئے اداریے تحریر کرنے کا سلسلہ بھی شروع کیا اور اس میں سید محمد تقی بھی تحریری طور پر حصہ لیتے۔ دیگر مشاہیر کی نگارشات بھی شائع ہوتیں۔ اُن ہی دنوں میں اُن کا ربط وضبط روشن خیال اور ترقی پسند خاتون افسانہ نگار اور صحافی، زاہدہ حنا سے ہوا اور یوں دونوں ازدواجی بندھن میں جُڑ گئے۔ زندگی میں زاہدہ کے علاوہ دو بیٹے اور ایک بیٹی کا بھی اضافہ ہو چلا۔ مگر یہ سفر بہت طویل ثابت نہ ہوا اور دونوں نے علیحدگی اختیار کرلی۔ جونؔ جو پہلے ہی تنہائی اور شکستہ پائی کا شکار تھے، کچھ اور بھی ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئے۔

عشق سمجھے تھے، جس کو وہ شاید
تھا بس اک نارسائی کا رشتہ
میرے اور اُس کے درمیاں نکلا
عمر بھر کی جدائی کا رشتہ

جونؔ، جو لکھ رہے تھے مقبولِ عام ودوام کی منزل پر پہنچ رہا تھا۔ ملکی فضا دگرگوں ہو چلی تھی۔

قیادت کا افلاس، دہشت گردی اور دیگر عوامل ملک کو صدیوں پیچھے لے جارہے تھے۔ جونؔ کیسے اور کیوں چپ رہتے؟

گزشتہ عہد، گزرنے ہی میں نہیں آتا
یہ حادثہ بھی لکھو، معجزوں کے خانے میں

جو رَد ہوئے تھے جہاں میں، کئی صدی پہلے
وہ لوگ، ہم پہ مسلط ہیں اس زمانے میں

آج کا دن بھی عیش سے گزرا
سر سے پا تک بدن سلامت ہے

کون اس گھر کی دیکھ بھال کرے
روز اِک چیز ٹوٹ جاتی ہے

جونؔ کا پہلا مجموعۂ کلام بہت تاخیر سے سامنے آیا اور جس وقت اُس نے اشاعت کا لبادہ اوڑھا تو جونؔ عُمر کی تقریباً چھٹی دہائی اوڑھ چکے تھے۔ اس تاخیر کی وجہ خود جونؔ نے "نیاز مندانہ" کے عنوان سے تحریر کیے گئے کتاب کے مقدمے میں تحریر کی اور بتایا کہ میرے عالم باپ نے میرے لڑکپن کی ایک سہ پہر میں اُداسی کی کیفیت میں مجھ سے وعدہ لیا کہ میں بڑا ہو کر اُن کی کتابیں شائع کراؤں گا۔ میں یہ وعدہ ایفانہ کرسکا اور بابا کی تقریباً تمام تصانیف ضائع ہوگئیں اور اس احساسِ جرم کے تحت میں اپنے کلام کی اشاعت سے گریزاں ہی نہیں، بلکہ متنفر رہا ہوں۔ یہ تو وہ سبب تھا، جو تاخیر کا باعث بنا، تاہم "شاید" (1989) نے منظرِ عام پر آتے ہی دُھوم مچادی۔ مجموعۂ کلام کی پذیرائی تو اپنی جگہ، اُس میں جونؔ کے تحریر کیے گئے مقدمے نے لوگوں کے دل جیت لیے اور جونؔ شاعری کے ساتھ نثر میں بھی اپنی عالمانہ حیثیت منوا گئے۔ اپنی اوّلین اشاعت کے بعد سے اب تک "شاید" کے نو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اگر جونؔ کی زندگی سے موت تک کے

سفر پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے تو جو بات واضح طور پر سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ جونؔ از اوّل تا آخر ایک شاعر تھے۔ ایسا شاعر، جس نے فقط اور فقط پڑھنا لکھنا، اوڑھنا اور بچھونا بنایا۔ یہ مصرع صرف جونؔ ہی کہہ سکتے تھے۔

صرف زندہ رہے ہم تو مر جائیں گے

اور بالآخر 8 نومبر 2002ء کو جونؔ زندہ رہنے کے لئے مر گئے۔ زندگی کے آخری دن کا اور جونؔ کا آخری شعر کسی ہونے والے واقعے کی پیش گوئی کرتا نظر آتا ہے۔

جانے کیا واقعہ ہے ہونے کو
جی بہت چاہتا ہے رونے کو

"یعنی"، "گمان"، "لیکن"، "گویا" وہ مجموعۂ ہائے کلام ہیں، جو جونؔ کے انتقال کے بعد منظر عام پر آئے۔ "فرنود" میں جونؔ کے وہ نثری شہ پارے شامل ہیں، جو انہوں نے رسالے "انشاء" اور "سسپنس ڈائجسٹ" کے لئے تحریر کیے۔

☆☆☆☆

ادب اور صحافت کا چراغ

مزاحیہ کالم نگاری اور چراغ حسن حسرت

مزاح نگاری کے ذریعے شہرت پانے والے ادیب تو بہت ہیں، تاہم اگر اس بات پر گفتگو کی جائے کہ مزاحیہ اخباری کالموں کو بنیاد بنا کر کون کون سے ادیب لوگوں کے دلوں میں جگہ بنانے میں کامیاب ہوئے تو ایسی فہرست میں، جو نام صفِ اوّل میں نظر آتا ہے، وہ چراغ حسن حسرت کا ہے۔ ممتاز شاعر، ادیب اور صحافی، شورش کاشمیری نے پنجاب میں اُردو صحافت کو کامیاب بنانے والے عناصرِ اربعہ میں چراغ حسن حسرت کو بھی شامل کیا ہے۔ بقیہ تین نام ظفر علی خان، غلام رسول مہر اور عبدالمجید سالک ہیں۔

1904 میں بارہ مولہ، کشمیر میں پیدا ہونے والے چراغ حسن جب سنِ شعور کو پہنچے تو اپنے نام کے ساتھ حسرت کا لاحقہ بطور تخلص استعمال کرنے لگے، یوں وہ چراغ حسن حسرت کے نام سے ادبی دنیا میں معروف ہوئے۔ 1920 میں شملہ میں ایک اسکول میں اُردو اور فارسی پڑھانے پر مامور ہوئے اور اسے ہی ان کی عملی زندگی کا آغاز قرار دیا جاسکتا ہے۔ تاہم طبیعت کی بے قراری کسی اور جادۂ عمل کی تلاش میں تھی اور جلد ہی سیماب صفت چراغ، ایک آفتاب سے متعارف ہوا اور یوں چراغ کی لو کچھ اور بڑھ گئی۔ ہوا یوں کہ مولانا ابوالکلام آزاد سے چراغ حسن حسرت کی ملاقات ہوئی، جو التفات میں بدلی اور چراغ اسکول کی ملازمت کو خیر باد کہہ کر کلکتہ (اب کول کتہ) چلے آئے، جہاں ابوالکلام آزاد اپنے مشہورِ زمانہ اخبار "الہلال" کی بارِ دیگر اشاعت کی کوششوں میں مصروف تھے۔ اسی کے ساتھ وہ ایک ہفت روزہ "پیغام" کا اجراء بھی کرنا چاہتے تھے، جس میں کام کرنے کے لئے انہوں نے چراغ کو آمادہ کرلیا۔ چراغ نے کام کی ابتدا کی اور غیر شعوری طور پر

آزاد سے اثر قبول کرنے کا بھی آغاز ہوا، جس کا اعتراف چراغ نے ہمیشہ اور کھلے عام کیا، تاہم یہ سفر دیرپا نہ رہا اور چراغ ''پیغام'' کی ملازمت ترک کر کے واپس کشمیر چلے آئے۔ 1925 میں وہ ایک بار پھر کلکتہ پہنچے اور روزنامہ ''نئی دنیا'' سے وابستہ ہوئے۔ یہاں اُنہوں نے ''کولمبس'' کے قلمی نام سے ''کلکتے کی باتیں'' کے عنوان سے کالم لکھنے کا آغاز کیا۔ اس کالم کو عوام اور خواص میں یکساں مقبولیت حاصل ہوئی۔ ابوالکلام آزاد، ظفر علی خان اور محمد علی جوہر کالم کے مندرجات کو چراغ کے قلمی کمالات سے تعبیر کرنے لگے۔ صحافتی مصروفیات کے دوش بدوش شعری معاملات بھی جولانگاہِ حسرت کی توجہ کا مرکز بنے رہے اور گاہے نوکِ قلم سے اس طرح کے اشعار نکلتے رہے۔

آؤ حُسنِ یار کی باتیں کریں
زلف کی رُخسار کی باتیں کریں

زلفِ عنبر یار کے قصے سنیں
طرۂ طرّار کی باتیں کریں

یارب غمِ ہجراں میں، اتنا تو کیا ہوتا
جو ہاتھ جگر پہ ہے، وہ دستِ دُعا ہوتا

رات کی بات کا مذکور ہی کیا
چھوڑیے، رات گئی بات گئی

غیروں سے کہا تم نے، غیروں سے سنا تم نے
کچھ ہم سے کہا ہوتا، کچھ ہم سے سنا ہوتا

''نئی دنیا'' کے بعد چراغ حسن حسرت نے ''عصرِ جدید'' کلکتہ میں نائب مدیر کے طور پر خدمات انجام دینا شروع کیں۔ یہاں اُنہوں نے ''کوچہ گرد'' کے قلمی نام سے مزاحیہ کالم ''مطائبات'' تحریر کرنا شروع کیا۔ اس کالم کی شہرت طوفانی رہی، مگر اخبار سے چراغ کی وابستگی

طولانی نہ رہ سکی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اخبار مسلم لیگ کی سیاسی حمایت کرتا تھا، جب کہ چراغ حسن حسرت ذہنی طور پر ابوالکلام آزاد کے زیرِ اثر تھے، جو کانگریس کے سرکردہ رہنماؤں میں شمار کئے جاتے تھے۔ 1926 میں چراغ نے کلکتہ سے "آفتاب" کے نام سے اخبار کا اجراء کیا، جو ڈیڑھ برس روشن رہ سکا، تاہم اس مدت میں اس نے قارئین کا ایک وسیع حلقہ بنالیا۔

چراغ کی سیمابی اور متلون طبیعت نے اس مرتبہ "استقلال" کے ساتھ کام کرنے کا منصوبہ بنایا، مگر یہ ساتھ بھی جاری نہ رہا۔ اس سے اگلی منزل "جمہور" تھی، جو برِصغیر کی آزادی کے لئے کام کررہا تھا۔ 1928 برِصغیر کی سیاسی تحریک میں ایک ہلچل کا باعث بنا، کیونکہ اس سال "نہرو رپورٹ" سامنے آئی، جس کو مسلم لیگ اور مسلمانوں نے عمومی طور پر مسترد کردیا اور اس کے جواب میں اگلے برس قائداعظم نے اپنے مشہور "چودہ نکات" پیش کئے۔ چراغ نے "نہرو رپورٹ" کے دفاع میں کئی کالم تحریر کیے، جس کی بناء پر انہیں سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ نتیجے کے طور پر کلکتہ چھوڑنا پڑا، تاہم اُس وقت ظفر علی خان وہیں موجود تھے۔ اُنہوں نے چراغ سے لاہور آنے اور "زمیندار" میں کام کرنے کی پیش کش کی۔ چراغ نے آمادگی ظاہر کی اور 1929 میں لاہور چلے آئے، جہاں ادیبوں اور صحافیوں کی ایک کہکشاں آباد تھی اور گویا ادب اور صحافت کا حسین امتزاج چراغ کے مزاج سے ہم آہنگ تھا۔ "زمیندار" میں انہوں نے "افکار و حوادث" کے عنوان سے کالم لکھے، جو پہلے عبدالمجید سالک تحریر کیا کرتے تھے۔ اگلی منزل روزنامہ "احسان" تھی۔ اس کے بعد "شیرازہ" کے نام سے ایک ہفت روزہ جاری کیا، جس میں اُن کے سلسلے "جدید جغرافیہ پنجاب" کو شہرتِ عام حاصل ہوئی۔ 1940 میں چراغ حسن حسرت نے آل انڈیا ریڈیو سروس میں شمولیت اختیار کی۔ اُس سے اگلی منزل فوجی زندگی کی ابتدا تھی، جہاں اُنہوں نے فوجیوں کے لئے اخبار نکالا، جس کے عوض میجر کے عہدے پر تعینات کئے گئے۔ 1945 میں وہ سنگاپور بھیجے گئے، جہاں اُنہوں نے "جوان" کے عنوان سے فوجیوں کے لئے ایک اخبار کا اجراء کیا۔ یہ اخبار رومن اردو میں شائع ہوتا تھا۔ 1947 میں وطن واپس آئے اور اگلے برس "امروز" لاہور کی ادارت سنبھالی، مگر جلد ہی انتظامیہ سے اَن بَن کے باعث ملازمت ترک کردی۔

1951 میں ریڈیو پاکستان، کراچی میں شمولیت اختیار کی، تاہم زیڈ اے بخاری سے اختلافات کے باعث ملازمت سے استعفیٰ دے کر 1953 میں لاہور چلے آئے۔ اب صحت کے مسائل آڑے آنے لگے۔ ریڈیو پاکستان، لاہور اُن کے صاحب کار رہنے کی آخری سرکاری مصروفیت قرار پایا، جس کے لئے وہ چند پروگرام انجام دے سکے اور بالآخر 26 جون 1955 کو مزاحیہ کالم نگاری کا روشن چراغ ہمیشہ کے لئے بجھ گیا۔

اُن کی تصانیف میں کیلے کا چھلکا، مطائبات (مزاحیہ تحریروں کا مجموعہ) دو ڈاکٹر، مردم دیدہ (قلمی خاکے)، پربت کی بیٹی، اقبال نامہ، کشمیر، سرگزشت اسلام، بغاوت عرب اور کرنل لارنس شامل ہیں۔ چراغ حسن حسرت کی ادبی خدمات پر طیب منیر نے پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا ہے۔ روزنامہ جنگ کراچی نے اُن کی وفات پر 28 جون کو اداریہ شذرہ تحریر کیا۔ اُردو کے بے مثل قطعہ نگار، رئیس امروہوی نے ''چراغ معانی'' کے عنوان سے اُن کی تاریخ وفات قلم بند کی۔ اُس کے چند اشعار پیشِ خدمت ہیں:

وہ حسرتؔ چراغ حریم صحافت
کہ تھا خسرو خاور نکتہ دانی

قلم اُس کا نقاشِ ''حرف و حکایت''
سُخن اُس کا خلاقِ رمز و معانی

صداقت سے پُر اُس کا اسلوب انشا
غلو سے تہی اُس کی شیوا بیانی

لطیفے برستے تھے، اُس کے قلم سے
وہ تھا اک جہانِ فصاحت کا بانی

☆☆☆☆☆

رئیس قلم: رئیسؔ امروہوی

(رئیس امروہوی 12 ستمبر 1914 کو ہندوستان کے مردم خیز خطّے ''امروہہ'' میں پیدا ہوئے۔ وہ باکمال شخصیت کے مالک تھے۔ اُن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اُردو زبان وادب کی ترویج وترقی کے لئے وقت تھا۔ وہ تمام زندگی روزنامہ ''جنگ'' سے وابستہ رہے، اس سے اُن کی مستقل مزاجی اور وفاداری کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ رئیس امروہوی بنیادی طور پر شاعر تھے، لیکن اُن کی نثر بھی اپنا ایک شجرۂ نسب رکھتی ہے۔ ''جنگ'' میں شائع ہونے والے اُن کے کالم اور قطعات ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ 22 ستمبر 1988ء کو دشمنانِ ملک وملت نے اُنھیں شہید کردیا تھا۔ اُن کی 27 ویں برسی کی مناسبت سے ہم یہاں ''جنگ'' میں شائع ہونے والے، اُن کے قطعات پیش کر رہے ہیں، جو آج بھی حالاتِ حاضرہ پر بہترین تبصرہ ہیں۔ اُن کے فن وشخصیت کے حوالے سے ڈاکٹر قمر عباس کا ایک مضمون بھی پیش خدمت ہے۔ ادارہ جنگ)

خاکِ امروہہ سے جنم لینے والے چند جبہ خاک کچھ ایسے تابناک چہروں کے مالک رہے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے کہ اُن کے وجود سے ساطع ہونے والی روشنی بیتاب آفتاب وماہتاب سے مستعار لی گئی ہو۔ ایسے ہی ذی وقار لوگوں میں ایک نام رئیسؔ امروہوی ہے۔ عالم باپ سید شفیق حسن ایلیا عربی، فارسی، عبرانی، سنسکرت اور انگریزی پر عبور رکھتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے واحد ماہر علم ہیئت تھے جو گرینچ رصدگاہ کی نوبہ نو ہونے والی دریافتوں سے لمحہ بہ لمحہ واقف رہنے کے لئے ہمہ وقت آمادہ رہتے تھے اور اس ذیل میں برطانیہ کے نامور ماہرین علم ہیئت سے رابطہ رکھتے تھے۔ اُن ہی شفیق حسن ایلیا کے گھر 12 ستمبر 1914 کو ایک بچے نے جنم لیا، جس کا نام سید محمد مہدی تجویز کیا گیا۔ بچے کی طبیعت کی سیمابی اُس کی غیر معمولی اکتسابی صلاحیتوں کی اطلاع فراہم کرتی نظر آتی تھی۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ یہ پارہ صفت کسی مقامِ رفعت

کی تلاش میں سرگرداں و پریشاں رہے گا۔ اور ایسا ہی ہوا۔ سید محمد مہدی، رئیس امروہوی کے قلمی نام سے ادب و صحافت کے خارزار کو گلزار بنانے چلے آئے۔ تعلیمی میدان میں نصاب کے بجائے اکتساب سے شغف اُن تک سلف سے پہنچا تھا۔ تاہم اُس گھرانے کے رواج کے مطابق ابتدائی مدارج جو گھر پر طے کیے گئے، اُن میں عربی اور فارسی کی تعلیم شامل تھی۔ اُس سے اگلی منزل امروہے کے سید المدارس سے تحصیل علم تھی، جہاں سے رئیس نے ادیب کامل اور ادیب فاضل کا امتحان پاس کیا۔ اسی دوران میں نواب وقار الملک کے داماد صبغۃ اللہ سے انگریزی تعلیم کے لیے مسلسل رابطہ رکھا۔ امروہے کی زرخیز و شاداب زمین علم و آگہی اور شعر و سخن کے لئے مثالی سمجھی جاتی تھی۔ ایسی فضا ایک علم کے جُویا اور فکر کے رسیا کو خوب راس آئی۔ پہلا شعر 1925 میں کہا۔

جب طبیعت مری گھبراتی ہے
دل دہی کو تری یاد آتی ہے

1931 میں پہلا مشاعرہ پڑھا۔ پڑھی گئی غزل کا مطلع تھا۔

قصہ نہ پوچھ مجھ سے شب انتظار کا
ہر اشک آئینہ ہے، مرے حالِ زار کا

امروہے کے اُسی تہذیبی و تمدنی ماحول میں قصائد، محافل، میلاد اور مجالس کے سلسلے میں رئیس کا قلم بے تکان اور بے گمان چلتا رہا۔ یہ تو ادبی اور مجلسی مشاغل کا معاملہ تھا۔ اُدھر سیاسی محاذ پر برصغیر جو فرنگیوں کا اسیر تھا، کسمسا کر آزادی کی پُر جوش فضاؤں کے خیر مقدم کو ہر کام پر مقدم سمجھنے لگا۔ رئیس کی صحافیانہ زندگی کا آغاز ہو چلا۔ "حیات"، "ادراک"، "اتحاد"، "قرطاس"، "انصاف"، "پبلک گزٹ"، "مسافر"، "جدت"، "تنویر"، "مخبر عالم"، "پیام دکن" وہ ماہنامے، ہفت روزہ اور روزنامے تھے جو رئیس کی نثر اور شعر گوئی سے سجتے رہے۔ اسی دوران میں رئیس افسانہ نگاری کی

طرف متوجہ ہوئے۔ پہلا افسانہ "سنگ تراش" 1931 میں ماہنامہ "حیات" امروہہ میں شائع ہوا۔ یہ سلسلہ کافی وقت تک جاری رہا اور جن پرچوں میں افسانے شائع ہوئے ان میں ماہنامہ "مسافر" مراد آباد، ماہنامہ "مشہور" دہلی، ماہنامہ "جمالستان" دہلی، ماہنامہ "جدت" مراد آباد شامل ہیں، افسانہ نگاری کا یہ سلسلہ قیامِ پاکستان کے بعد بھی جاری رہا۔ 1934 میں رئیسؔ ایک نئے سفر پر روانہ ہوئے اور یہ سفر ازدواجی زندگی کے آغاز کا تھا۔ وقت کچھ اور آگے بڑھا۔ 1935 کا زمانہ آیا۔ برصغیر میں انگریزوں کا متعارف کردہ "نیا قانون" نافذ ہوا۔ اُس زمانے کی عملی سیاست رئیسؔ کی کشاکشِ زیست کے لئے کشش کا باعث بنی رہی اور وہ کانگریس کے زیرِ سایہ دامے درمے قدمے سخنے حصہ لینے لگے۔ مشاہیر کو دیکھنے، سننے اور اُن سے گفتگو کرنے کا موقع میسّر آیا۔ شاعر، ادیب، دانشور، سیاست داں، غرض عقل و دانش کو آواز دینے اور زندگی کو سوز و ساز دینے کے جملہ وسائل مہیا ہو گئے۔ محمد علی جوہرؔ، مولانا شوکت علی، حسرتؔ موہانی، علامہ اقبالؔ، مولانا ظفر علی خان، خواجہ حسن نظامی، علامہ مشرقی، قائدِ اعظم محمد علی جناح، مہاتما گاندھی، راجا صاحب محمود آباد، نوابزادہ لیاقت علی خان، سجاد ظہیر، ڈاکٹر محمد اشرف اور جواہر لال نہرو، وہ ہستیاں تھیں جن کو دیکھا یا جن سے ملاقاتیں رہیں۔ نہرو کے لئے رئیسؔ نے نظم بھی لکھی۔

اے جواہرؔ لال، اے مظلوم بھارت کے سپوت
کیا تری قربانیاں ہیں، جو نہیں ملتا ثبوت

تاہم جب کانگریس مسلمانوں کے باب میں ناانصافی کا ارتکاب کرنے کی طرف مائل ہوئی تو رئیسؔ 1939 میں مسلم لیگ کے پرچمِ حریت کو تھام کر اپنی آواز کو ایک نئی پرواز سے ہم آہنگ کرنے لگے۔ اب قلم اور قدم ایک نئی منزل کی طرف رواں دواں ہو گئے۔ وہ منزل جو جذبے میں فولادی اور عمل میں سرتاسر آزادی تھی۔ قراردادِ پاکستان منظور ہوئی اور نئی مملکت کے کچھ خطوط واضح ہوئے۔ سرخوشی و سرشاری میں ایک نظم کہی، جس کا شعر زباں زدِ خاص و عام اور حریت کا پیغام بن کر قریہ قریہ گونجنے لگا۔

یاد رکھو! وقت کا فرمان ٹل سکتا نہیں
موت ٹل سکتی ہے، پاکستان ٹل سکتا نہیں

تحریک تیز ہوگئی اور بالآخر وہ منزل سر ہوگئی، جس کے لئے بے محابا اور بے تحاشا سر دیئے گئے۔ اب اعلانِ آزادی کی شیریں آواز سماعتوں میں رَس گھولنے لگی۔ ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کا قیام عمل میں آ گیا۔ رئیسؔ تین عشروں سے کچھ اوپر ہندوستان میں گزاری گئی علم پرور اور ہنگامہ خیز زندگی کو الوداع کہہ کر پاکستان چلے آئے۔ زندگی کا اُمنگوں اور رنگوں بھرا دور ختم ہوا۔ اب نیا ملک تھا، نئے لوگ تھے، نئی تہذیب اور نیا تمدّن۔ جہاں زندگی کی ہنگامہ خیزی ایک نئے رُوپ میں اُن کی منتظر تھی۔ رئیسؔ کا وہ قلم جسے امروہےؔ کی خاک نے استقامت بخشی تھی، کراچی کی خاک نے استقامت کے ساتھ کرامت بھی عطا کر دی۔ اوّل اوّل روزنامہ جنگ کراچی کے مدیر کے طور پر صلاحیت کار کا آغاز کیا۔ ادارتی ذمے داریوں کے پہلو بہ پہلو قطعہ نگاری کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہوگیا جس کی شاید رئیسؔ کو خود بھی توقع نہ ہو گی۔ قطعہ نگاری اُن کی پہچان اور شان بن گئی۔ وہ کون سا واقعہ، حادثہ اور سانحہ تھا، جس کو رئیسؔ نے چار مصرعوں میں مشّاقی اور چابکدستی سے مقید نہ کیا ہو۔ اُن کے مصرعوں کا لبادہ اوڑھ کر واقعہ مجسّم شکل میں سامنے آ جاتا۔ وقت کے دو بڑے ہم عصر سیاستدان گاندھی جی اور قائداعظم 1948 میں دنیا سے چلے گئے۔ پہلے مہاتما گاندھی قتل کیے گئے، جس پر رئیسؔ نے چار مصرعوں میں اُن کی زندگی سے موت تک کا نقشہ کھینچا۔

جس نے اُمید زیست تھی باندھی
لے اُڑی اُس کو موت کی آندھی
گالیاں کھا کے، گولیاں کھا کے
چل بسے اُف، مہاتما گاندھی

اور جب بانیٔ پاکستان، قائداعظم محمد علی جناح، جن سے رئیسؔ کو بہت عقیدت تھی، انتقال کر

گئے تو رئیس نے چار مصرعے جگر خون کر کے کہے۔

چھن گئے ہم سے ہمارے قائدِ اعظم رئیس
کر دیا دستِ اجل نے کتنی اُمیدوں کا خون
مضمحل کر دے نہ یارب حوصلوں کو قوم کے
قائدِ اعظم کی موت انا الیہ راجعون

قطعہ نگاری اگرچہ رئیس سے پیشتر بھی برتی جا رہی تھی، مگر رئیس نے اس صنف کو اپنی اجتہادی، تخلیقی اور توفیقی قوتوں سے سخنوری کا اعجاز بنا دیا۔ یہ بالکل وہی معاملہ تھا جو مرثیہ نگاری کے ساتھ پیش آیا کہ انیس و دبیر نے اُس صنف کو بامِ عروج عطا کیا۔ گویا رئیس قطعہ نگاری کے انیس ثابت ہوئے۔ کثیر الاوصافی اور کثیر الاصنافی رئیس کا طرۂ امتیاز رہا۔ نظم، غزل، قصیدہ، مثنوی، ساقی نامہ، مسدس، مخمس، سہرا، سہاگ، تاریخ ہائے وفات، سلام، نوحے، مرثیہ، فلمی اور ریڈیائی ڈرامے، تاریخی اور مذہبی مضامین، سیاسی شذرہ نویسی، نفسیات، ما بعد النفسیات، جنسیات، توجہات، مراقبہ، ہپناٹزم، عالمِ برزخ، حاضراتِ ارواح، عالمِ ارواح، جنات۔ غرض مسلسل چلنے والے قلم سے جب انگلیاں فگار ہوئیں تو یہی رئیس کے لئے باعثِ افتخار ہوئیں۔

وہ صحیح مفہوم میں اپنی ذات میں انجمن ہونے کے علاوہ انجمن ساز بھی تھے۔ ہندوستان سے پاکستان تک کتنی ہی انجمنیں اُن کے دم قدم سے آباد رہیں۔ کراچی میں اُن کے گھر واقع گارڈن ایسٹ میں سجنے والی محفلوں میں نامور شخصیات بشمول جوش ملیح آبادی شرکت کرتیں۔ رئیس کی شخصیت کچھ ایسی جذب و کشش رکھتی تھی کہ صدہا لوگ روزانہ ملنے آتے۔ اپنے مسائل حل کراتے۔ دوست، احباب، شاگرد، پرستار اُن سے بے اندازہ پیار کرتے۔ اَن گنت خطوط موصول ہوتے اور اُن کے جوابات دیئے جاتے۔ جنگ کے زمانے میں اُن کے قلم سے تحریر کیئے گئے ملی نغمے جوانوں کے دلوں کو گرماتے رہے۔

وہ گھرانہ جہاں رئیس ہوں، سید محمد تقی ہوں، جون ایلیا ہوں، اُس کے بارے میں بلاتر دد یہ

کہا جا سکتا ہے "ایں خانہ تمام آفتاب است"۔ علم وعقل کے دشمن معاشرے کے ایک ظلمت پسند انسان نے شوخی وظرافت، سنجیدگی ومتانت اور علم ودانش کا حسین پیکر رکھنے والے قلم اور دل کے رئیس کو 22 ستمبر 1988 کو گولی مار کر شہید کر دیا۔

رئیس کی تصنیف وتالیف کی طویل شعری ونثری فہرست میں جو کتابیں شامل رہیں، ان کے نام یہ ہیں۔ مثنوی لالہ صحرا، پس غبار، حکایت، الف، بحضرت یزداں، انا من الحسین، ملبوس بہار، آثار، نجم السحر، اچھے مرزا، نفسیات و مابعد النفسیات، عجائب نفس، لے سانس بھی آہستہ، جنسیات، عالم برزخ، حاضرات ارواح، عالم ارواح۔

میر تقی میر کا یہ شعر رئیس امروہوی پر خوب صادق آتا ہے۔

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

☆☆☆☆☆

سعادت حسن منٹو: اردو افسانے کا لازوال کردار

وہ ایک ایسا آدمی تھا، کہ جس سے نہ ترقی پسند خوش تھے اور نہ رجعت پسند۔ وہ ایک ایسا آدمی تھا،، جس سے نفرت بھی کی گئی اور محبت بھی۔ وہ ایک ایسا آدمی تھا کہ جس کی قدر بھی کی گئی اور ناقدری بھی۔ وہ ایک ایسا آدمی تھا، کہ اُس کی بدزبانی پر پاکیزہ بیانی رشک کیا کرتی۔ اُس کے مزاج میں سماج کی برہنگی کو پیرہن عطا کرنے کا کوئی تصور نہ تھا۔ نازی جرمنی کے پروپیگنڈا منسٹری کے مدار المہام جوزف گوبلز کا کہنا تھا کہ جھوٹ اتنا بولو کہ وہ سچ معلوم ہونے لگے۔

معلوم نہیں اُس نے یہ بات کس وقت، کس کے لئے اور کس کے سامنے کہی تھی۔ تاہم ہندوستان کے ایک افسانہ نگار نے گوبلز کے برعکس یہ تہیہ کیا کہ وہ سچ اتنا بولے گا کہ بوسیدہ سماج کا مکروہ چہرہ سب کے سامنے آجائے گا۔ یہ افسانہ نگار نہ صرف اپنے وقت کا بلکہ اپنے وقت سے کہیں آگے کا سب سے بڑا افسانہ نگار سعادت حسن منٹو تھا۔ سمرالہ کے ایک گاؤں پپڑودی (لدھیانہ)، مشرقی پنجاب میں 11 مئی 1912 کو غیر منقسم ہندوستان میں ایک بچے نے جنم لیا۔ خاندان کے زیادہ تر افراد بیرسٹر اور جج تھے، چنانچہ والد غلام حسن اور والدہ سردار بیگم (غلام حسن کی دوسری اہلیہ) کی خواہش ہوئی کہ بچے کو اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کیا جائے۔ بچے نے بنیادی تعلیم گھر ہی پر حاصل کی۔ منٹو کی والدہ جو پختون خاتون تھیں، منٹو کے وسیع کشمیری خاندان میں مناسب مقام واحترام سے محروم رہیں، جس کا منٹو کو بہت قلق تھا۔ ماں کی قربت کا متلاشی منٹو باپ سے شاکی رہتا اور یوں زندگی کے ابتدائی برسوں ہی میں منٹو اپنوں کی بے اعتنائی کا شکار اور سماج سے بیزار ہو گیا۔ گورنمنٹ ہائی اسکول، امرتسر سے 1931 میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ایم اے او کالج، امرتسر میں ایف اے کی تعلیم کے لئے داخلہ لیا۔ تاہم نامساعد گھریلو اور سماجی حالات حصول تعلیم میں حارج ہوئے اور تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا۔

تعلیمی زندگی کا اختتام قلمی زندگی کا آغاز ثابت ہوا۔ خوش قسمتی سے منٹو کا تعارف باری علیگ سے ہوگیا۔ عبدالباری علیگ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے فارغ التحصیل نامور مارکسی ادیب تھے۔ اُن کی تصانیف ''کمپنی کی حکومت''، ''تاریخ اسلام'' اور ''اجتماعیت عالم'' ادبی حلقوں سے خراج تحسین وصول کر چکی تھیں۔ باری علیگ سے مراسم نے منٹو کے ذہنی افق کو نئی وسعتوں سے آشنائی دلائی۔ سیاست اور بین الاقوامی ادب اور آرٹ سے رغبت منٹو میں باری علیگ کی بدولت ہوئی۔ منٹو نے بہت کشادہ دلی سے باری علیگ کی مدح سرائی کی۔ ایک مضمون میں منٹو نے تحریر کیا ''آج میں، جو کچھ بھی ہوں اسے بنانے میں سب سے پہلا ہاتھ باری صاحب کا ہے۔ اگر امرتسر میں بجے کے ہوٹل میں اُن سے ملاقات نہ ہوتی اور متواتر تین مہینے میں نے اُن کی صحبت میں نہ گزارے ہوتے تو یقیناً میں کسی اور ہی رستے پر گامزن ہوتا۔'' باری علیگ نے وکٹر ہیوگو کے شہرۂ آفاق ناول ''دی لاسٹ ڈیز آف کنڈ منڈ'' کے ترجمے کی طرف منٹو کو مائل کیا۔ منٹو نے محض دو ہفتے میں ترجمہ کر کے اُسے اُردو بک اسٹال، لاہور کو دیا، جس نے اُسے ''سرگزشت اسیر'' کے عنوان سے شائع کیا۔

اب منٹو، جو باقاعدہ ادیب کا روپ دھار چکا تھا، آسکر وائلڈ کے ڈرامے ''ویرا'' کو اُردو کا قالب دینے کی طرف متوجہ ہوا، جو 1934 میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔ منٹو، اب بائیں بازو کے سیاسی نظریات پر اس حد تک کاربند ہوگیا کہ امرتسر کے کوچۂ وکیلاں میں واقع اپنی اقامت گاہ کو ''دارالاحمر'' (سرخ دروازہ) قرار دیا۔ یہی نہیں بلکہ اپنے کمرے میں رکھے گئے چولہے کو، جس سے آگ نکلتی تھی، ''بھگت سنگھ'' کا نام دیا۔ وہ بھگت سنگھ، جو اپنے انقلابی نظریات کی پاداش میں فرنگی حکومت کے ہاتھوں محض 23 برس کی عمر میں تختۂ دار پر جھول گیا۔ ہالی وڈ ایکٹریس اور ڈانسر، جوآن کرفرڈ، جرمن نژاد امریکی ایکٹرس اور گلوکارہ، میرلین ڈاکٹرچ اور اپنے والد کی تصاویر کمرے کی دیواروں پر آویزاں کیں۔ لکھنے کی میز اور الماری کے آس پاس وکٹر ہیوگو، لارڈ لیٹن، میکسم گورکی، اینٹن چیخوف، پشکن، گوگول، دوستوفسکی، لیونڈ اینڈریو، آسکر وائلڈ اور موپساں کی تحریریں موجود ہوتیں۔ اب منٹو کی ذہنی سطح عمومی سطح سے کہیں بلند تھی۔ 1936 میں ماہنامہ ''عالمگیر'' کا ''روسی ادب'' مرتب کر کے تو منٹو اہلِ وطن کی نگاہوں کا مرکز بن گیا۔ منٹو کا پہلا افسانوی مجموعہ ''آتش

پارے" کے نام سے 1936 میں سامنے آیا۔ اپریل 1938 میں نکاح ہوا اور اپریل 1939 صفیہ نے منٹو کی زندگی میں ازدواجی رنگ بھر دیئے۔ ان رنگوں نے منٹو کو چند اور حقیقی رشتوں سے روشناس کرایا۔ عارف، نگہت، نزہت اور نصرت کی صورت میں منٹو کو اولاد کی نعمت لازوال حاصل ہوئی۔ تاہم بیٹا عارف محض ایک برس ہی میں انتقال کر گیا۔ برہنہ گفتاری کے عادی منٹو کا قلم سماجی حدود و قیود کی پابندیوں کو روندتا ہوا آگے بڑھتا چلا جاتا۔ ایسی صورت میں وہ جس سماجی علالت کو بے نقاب کرتا، اُس کی پاداش میں عدالت کا سامنا کرنا پڑتا۔ "کالی شلوار" (1942)، "بو" (1944)، "دھواں" (1944)، "ٹھنڈا گوشت" (1949)، وہ افسانے تھے، جنھوں نے ادبی دنیا میں ہلچل مچا دی اور افسانوں کی بے باکی نے عدالتی مقدمات کی ایک طویل تاریخ مرتب کر دی۔ ایسی تاریخ، جس میں پیہم عدالتی کارروائیوں کا سامنا کرنا پڑا، تاہم محض ایک موقع ایسا آیا جس میں منٹو کو معمولی سزا کا موجب ٹھہرایا گیا۔ تادیب کے طور پر منٹو کو پچیس روپے جرمانے کی سزا سنائی گئی۔ سزا کا یہ معاملہ 1953 میں لاہور کی ایک مقامی عدالت میں پیش آیا۔ مجسٹریٹ مہدی علی صدیقی نے منٹو کی وفات پر ایک تاثراتی مضمون میں اس کا تمام احوال قلم بند کیا تھا۔

اچھے کو اچھا اور بُرے کو بُرا کہنا اور بے جھجک کہنا، منٹو کی فطرتِ ثانی تھا۔ سماج کے محروم، مظلوم، نچلے اور کچلے طبقے کی زندگیوں کو اپنے بے مثال اور لازوال قلم سے پیش کر کے واپس سماج کے منہ پر مارنا منٹو کا کارنامہ اور افسانوی ادب کا سرنامہ تھا۔ اُس کے قلم سے افسانے مسلسل لکھے جاتے رہے۔ اچھے، بہت اچھے، بُرے، بہت بُرے، اعلیٰ، بہترین، شاہکار۔ اس نے اپنے افسانوں کی تخلیق کو اپنے قلم کی توفیق سے اُردو ادب کی تاریخ کا انمٹ حصہ بنا دیا۔ منٹو کے سامنے برصغیر کا کوئی محدود علاقہ نہیں تھا۔ وہ پورے برصغیر کے سماج سے واقف تھا۔ بمبئی (اب ممبئی)، کلکتہ (اب کول کتہ)، لکھنؤ، دہلی، امرتسر، لاہور، غرض سب کا تمدن اُس کے زیرِ غور تھا۔ افسانے، خاکے، ریڈیائی ڈرامے، فیچرز، مضامین، فلمی کہانیاں اور ایک ناول منٹو کی قلمی میراث ٹھہرے۔

اُردو افسانے میں حقیقت نگاری کی جس روایت کو پریم چند نے پروان چڑھایا، منٹو نے اُسے منزلِ کمال تک پہنچایا، تاہم ایک فرق یہ رہا کہ پریم چند کے یہاں دیہاتی زندگی کی عکاسی

رہی اور منٹو نے شہری سماج کے عوارض کو بے نقاب کیا۔ منٹو نے جب افسانہ نگاری کا آغاز کیا تو وہ ترقی پسند تحریک کے آغاز سے بھی پہلے کا دور تھا اور یہ سفر آزادی کے پہلے نصف عشرے تک جاری رہا۔ اُس پورے عرصے میں منٹو کے پہلو بہ پہلو احمد علی، حسن عسکری، بیگم رشید جہاں، اوپندر، ناتھ اشک، کرشن چندر، حیات اللہ انصاری، دیوندر ستیارتھی، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، علی عباس حسینی، واجدہ تبسم، احمد ندیم قاسمی وغیرہ اپنے قلم کی جولانیاں اور فکر کی توانائیاں دکھا کر معاشرے میں چھائے گھٹاٹوپ اندھیرے کو روشنائیاں اور رعنائیاں عطا کرتے رہے۔

منٹو کے قلم کی کاٹ کا موازنہ شاید کسی سے نہیں تھا اور اس کا سبب اُس کی زبان کی سادگی و پُرکاری، اعلیٰ ترین کردار نگاری اور کہانی کی بھرپور تیاری کا سہ آتشہ سلسلہ تھا، جس نے اُسے افسانہ نگاری کا درخشندہ ترین ستارہ بنا دیا، ایسا ستارہ، جس کی روشنی اور رعنائی کو خود اُسی کی نظر لگ گئی۔ منٹو کی شخصیت کا سانچہ مختلف کرداروں کی مٹی سے تیار ہوا تھا۔ مجرد اور مفرد منٹو نہ جانے کتنی شخصیات کا مرکب تھا۔ وہ تنہا تھا، مگر اُس کے اندر ایک دنیا آباد تھی۔ ایسی دنیا جس کے کرداروں میں روسی اور فرانسیسی ادب کی امر تحریریں، یورپ کی سرمایہ دارانہ سوچ سے فسطائیت تک کے سفر کی ترقی معکوس، وکٹر ہیوگو، میکسم گورکی، روماتوف، کروپاٹکن، انقلاب روس، جلیانوالہ باغ کا سانحہ، بھگت سنگھ کا کردار، سماجی ناہمواری کے نتیجے میں پیدا ہونے والی زیادتیوں کا استحصال بننے والے غریب اور مفلوک الحال عوام، تقسیم ہند سے قبل کا سسکتا ہندوستان اور آزادی کے بعد کا اُبھرتا اور سنبھالے نہ سنبھلتا پاکستان تھا۔ چند ہی ہوں گے جو پریم چند کے بعد افسانہ نگاری کو کمال کی منزل پر لے گئے اور سعادت حسن منٹو کو اُن ہی باکمال لوگوں کی صف اولین میں شمار کیا جاتا رہے گا۔

اُس کی زندگی ہنگامہ خیزیوں میں بسر ہوئی اور وہ اپنے مختصر افسانوں ہی کے مانند بیالیس برس کی مختصر مگر پُراثر زندگی گزار کر 18 جنوری 1955 کو دوسری دنیا کی طرف چل دیا۔ منٹو کی زندگی میں 37 مطبوعات شائع ہوئیں۔ منٹو کا کچھ تحریری اثاثہ انتقال کے بعد بھی سامنے آیا۔ منٹو کی وابستگی بحیثیت مدیر متعدد اخبارات و رسائل سے رہی، جن میں مدیر، ہلال، کالج میگزین، روزنامہ مساوات، امرتسر، مدیر خلق، امرتسر، ماہنامہ ہمایوں، لاہور، ماہنامہ عالمگیر، لاہور، مدیر ہفتہ وار

مصور، بمبئی ہفت روزہ سماج، بمبئی ہفت روزہ کارواں بمبئی ہفت روزہ کہکشاں، بمبئی ہفت روزہ احسان، لاہور، روزنامہ منشور، لاہور، روزنامہ امروز، لاہور، مدیر اردو ادب، لاہور، مدیہ ہفت روزہ نگارش، لاہور وغیرہ شامل ہیں۔

منٹو نے فلمی دنیا کے لئے بھی کہانیاں تحریر کیں۔ پہلے طبع زاد افسانے ''تماشہ'' سے اپنا افسانوی سفر شروع کرنے والے سعادت حسن منٹو کا آخری افسانہ ''کبوتر اور کبوتری'' تھا۔

ڈاکٹر سلیم اختر کا کہنا ہے:

''منٹو کے افسانے کا جادو ابھی تک سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ کیا اس لئے کہ وہ بہت بڑا ماہر فن تھا؟ تکنیک کے اسرار و رموز کا شناور تھا؟ اور جنس کا مبلغ؟ میرے خیال میں ان وجوہات کے ساتھ ساتھ ایک اور بھی اہم ترین وجہ ہے اور وہ ہے، اس کی حق گوئی و بے باکی اور اُن کی پیدا کردہ خود اعتمادی، جس نے اس میں وہ جرأت اظہار پیدا کردی کہ آخری وقت تک اپنے مورچہ پر ڈٹا رہا، یہی نہیں بلکہ آج کا عہد اپنے منٹو کی تلاش میں نظر آتا ہے۔ اس دور منافقت میں ہمیں منٹو کے روپ میں اس جرأت کی ضرورت ہے، جو منافقت کے رنگ سے پاک ہو۔ منٹو میں تلخ سچائی کو دیکھنے، اُسے پرکھنے اور یوں اس کے برملا اظہار کی جو جرأت تھی آج وہی ہم میں نہیں رہی۔''
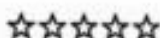
فکرودانش کی ایک توانا آواز: سیّد محمد تقی

علم ودانش اور شعروادب کے سلسلے میں ہندوستان کی ریاست یوپی کا قصبہ امروہہ اپنی مثال آپ ہے۔ جس کو دیکھو لکھنے پڑھنے کی دُھن میں مگن، جدھر دیکھو گفتگو اور مکالمے کی فضا، جس سے ملو علم وادب کی باتیں۔ شاید یہی سبب ہے کہ اس مختصر سے خطۂ زمین نے برِصغیر کو بے مثل و بے مثال افراد دیے۔ مصحفیؔ، نسیمؔ امروہوی، رئیسؔ امروہوی، صادقینؔ، کمالؔ امروہوی، جون ایلیا، اقبالؔ مہدی وہ نام تھے جو اپنے اپنے شعبوں میں سرافراز اور باعثِ ناز تھے۔ تاہم ان ہی ناموں میں ایک نام اور بھی ہے جو اس فہرست کو اور بھی اعتبار اور وقار عطا کر رہا ہے اور وہ نام ہے سید محمد تقی کا، جس نے ادب، شعر، تمثیل نگاری اور مصوّری میں نہیں بلکہ فلسفے جیسے اَدق اور مشکل موضوع میں اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے۔ اگرچہ ادبی معاملات پر اظہارِ خیال سے یکسر گریز کا یوں امکان نہ تھا کہ خون میں شرافت کے ساتھ ادب کی روانی امروہے کی تابندہ نشانی تھی۔ گویا امروہے کی خاک زیرِ افلاک اپنے گنج ہائے گرانمایہ کے ساتھ فضا کو تابناک بنا رہی تھی۔

نومبر 1917 میں شفیق حسن ایلیا کے گھر میں دوسرے بچّے نے جنم لیا۔ اس کا نام سید محمد تقی رکھا گیا۔ پہلے بچّے کا نام سید محمد مہدی تھا جو ادبی اور صحافتی دنیا میں رئیسؔ امروہوی کے نام سے پہچانا گیا اور اُردو قطعہ نگاری کا سب سے بڑا شاعر جانا گیا۔

شفیق حسن ایلیا خود ایک عالم تھے۔ اُردو، عربی، فارسی، انگریزی، ہندی، سنسکرت اور عبرانی وہ زبانیں تھیں جو شفیق حسن ایلیا کی دسترس میں تھیں۔ شعر گوئی اور شعر فہمی کا معمول تھا۔ نثر کی طرف عمومی رجحان جب کہ فلسفہ بھی دلچسپی کا ایک میدان تھا، تاہم فلکیات سے خصوصی میلان تھا۔ اس عنوان سے وہ جدید ترین معلومات سے باخبر رہتے تھے۔ برطانوی رصدگاہوں کی تیز تر تبدیلیوں سے آگاہی کے لیے برٹرینڈ رسل سے خط وکتابت معمول کی بات تھی۔

ایسی فضا میں سید محمد تقی کی تربیت شروع ہوئی۔ بچہ اوائل عمری ہی سے حرف سے ناتا اور لفظ سے رشتہ استوار کر بیٹھا۔ جب دوسرے بچے اقتضائے عمر اور تقاضائے طبیعت کے عین مطابق کھیل کود میں مصروف رہتے تو یہ بچہ اس وقت بھی کتب کی ورق گردانی کار زندگانی سمجھتا۔

اب مطالعہ اور مباحث مزا دینے لگے۔ ماں نے بچے کی مسلسل گفتگو کی عادت کو دیکھتے ہوئے اُسے "ریڈیو" کا نام دے دیا۔ گزرتا ہوا ایک ایک لمحہ اور ایک ایک دن مطالعے کی پختہ عادت کے تحت ذہن کو سوالات کی آماجگاہ بنائے چلا جا رہا تھا، اور یوں بچے نے ابتدا ہی سے کائناتی مسائل و معاملات کے لیے تفکر و تعمق کی چادر اوڑھ لی۔ غور و فکر محبوب معاملہ اور فلسفیانہ کتب کی ورق گردانی مرغوب کار مشغلہ قرار پایا۔

ابتدائی تعلیم میں اُردو، فارسی اور عربی کے ساتھ مذہبی تعلیم کے طور پر قرآن و حدیث کی تعلیم اور فارسی اور عربی کی کلاسیکی ادبیات بھی شامل نصاب رہی۔ 1930 وہ سال تھا جب پنجاب یونی ورسٹی سے منشی کا امتحان دیا، جو دسویں درجے کے مساوی مانا جاتا تھا۔ 1933 ایک اور کامیابی لے کر آیا۔ سید محمد تقی نے الہ آباد سے ادب کا سب سے بڑا امتحان "فاضل ادب" پاس کیا۔ نصاب میں اُردو نثر، نظم، بلاغت اور تاریخ کے مضامین شامل تھے۔ 1934 میں اپنی جنم بھومی امروہہ کے "سید المدارس" سے مولوی کا امتحان پاس کیا۔ یہ مدرسہ الہ آباد بورڈ سے وابستہ تھا۔ 1935 میں پنجاب یونی ورسٹی سے مولوی عالم کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ اس سے اگلے برس 1936 میں مولوی فاضل کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ اس کے نصاب میں فلسفہ، تفسیر، حدیث، فقہ، منطق اور تاریخ وغیرہ شامل تھے۔ یہ امتحان عربی میں لیے جاتے تھے۔ مولوی عالم اور مولوی فاضل کا امتحان دو برس کی مدت پر محیط ہوتا تھا۔ سید محمد تقی نے یہ امتحان اپنی طبعی ذہانت سے محض ایک برس میں پاس کیا اور نہ صرف پاس کیا بلکہ بہت اعلیٰ طور پر پاس کیا۔ اس سے اگلے سال یعنی 1937 میں بی اے میں کامیابی حاصل کی۔

اُن ہی دنوں شعر سے قربت شاعری سے رفاقت کا سبب بنی اور "صدر" کے تخلص کے ساتھ اشعار کہنے لگے، تاہم یہ سلسلہ زیادہ دیر جاری نہ رہا۔ برصغیر کی سیاسی فضا ہنگامہ پرور ہو چلی تھی۔

آزادی کی تحریک میں سمندر کی لہروں کے مانند تموّج پیدا ہو رہا تھا۔ ایسی فضا میں علم دوست اور حرف شناس سید محمد تقی وطن پرست کیمونسٹ بن گئے، چنانچہ "کھدر" عمومی پہناوا قرار پایا۔ اب اُن کا رجحان واضح طور پر وقت کی بڑی سیاسی جماعت کانگریس کی طرف ہو گیا۔ 1937 سے 1939 تک سید محمد تقی اپنے نازشِ روزگار بھائی رئیس امروہوی کی سنگت میں باقاعدہ طور پر کانگریس کے رکن بن گئے۔ 1940 میں وہ آل انڈیا مسلم لیگ میں بطور رضا کار شامل ہوئے اور ایک کتابچہ "پاکستان اسٹالن کی نظر میں" تحریر کیا۔

برادرِ بزرگ رئیس امروہوی کے ساتھ تو اُن کا تو ہر وقت کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ اس کے علاوہ کمال امروہوی، نسیم امروہوی اور ذیشان حیدر سے بھی علمی صحبتیں رہتیں۔ عالم باپ کی وساطت سے دیگر اہل علم وادب کی آمد ورفت بھی معمول کی بات تھی۔ یہ تمام ہنگامے تو اپنی جگہ تھے، سید محمد تقی فلسفے کے مشکل ترین سبق کے ہر ہر ورق کو پوری توجہ اور سنجیدگی سے پڑھنا چاہتے تھے۔ فلسفے سے یہی عشق دہلی یونی ورسٹی سے ایم اے (فلسفہ) کی سند دلانے کا محرک ٹھہرا۔

فلسفے کے پہلو بہ پہلو صحافت بھی ترجیحات کا ایک نمایاں میدان رہا۔ ماہنامہ "مسافر" مراد آباد سے 1938 میں وابستگی اختیار کی۔ یہی صحافتی زندگی کا آغاز تھا۔ اس کے بعد دہلی میں "حریت"، "آریہ ورت"، "مسلمان"، "شمع"، "چنگاری" اور "انجام" میں بھی کام کیا۔ "ایشیا" میرٹھ صحافتی مشغولیت کی اگلی منزل تھی۔ تحریک پاکستان کے زمانے میں مسلم لیگ اور قائداعظم کی حمایت میں سلسلہ مضامین قائم کیا۔ جن اخبارات کے لیے یہ مضامین تحریر کیے گئے اُن میں سہ روزہ "الامان" اور روزنامہ "جنگ" بھی شامل تھے۔

یہی وہ موقع تھا جب روزنامہ جنگ کے مالک میر خلیل الرحمان سے مراسم استوار ہوئے، جو دوستی میں تبدیل ہوئے اور یوں وہ "روزنامہ جنگ"، دہلی سے وابستہ ہو گئے۔ تقسیم کے بعد جب روزنامہ جنگ ہجرت کے سفر سے گزرا اور کراچی اُس کا مستقل ٹھکانہ قرار پایا تو سید محمد تقی بھی ہجرت کر کے کراچی آ گئے اور بحیثیت مدیر اس سے وابستگی اختیار کر لی۔

اخبار کے لیے تحریر کیے گئے اُن کے اداریے اور مضامین سنجیدہ مزاج قارئین کی علمی تشنگی کو

سیراب کرنے کا بڑا ذریعہ بنتے۔ اگرچہ اب صحافت اُن کا کُل وقتی کاروزگار تھا، تاہم فلسفہ اب بھی اُن کا اوّلین عشق تھا۔ سید محمد تقی نے فلسفیانہ افکار کو اُردو میں منتقل کرنے کا بیڑا اٹھایا اور اس سلسلے کا آغاز جس کتاب سے کیا، وہ مشہور جرمن فلسفی، اشتراکیت کے سب سے بڑے علمبردار، اقتصادیات اور ساجیات کے ماہر، تاریخ دان کارل مارکس (1818-1883) کی کتاب "داس کیپٹال" تھی، جسے انیسویں صدی کی عظیم ترین کتاب کہا جاتا ہے اور ہر دور میں تاریخ کی امہات کتب میں شمار کیا جاتا ہے۔

بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے انجمن ترقی اردو ہند سے وابستگی کے وقت مشہور ترین عالمی کتابوں کو اُردو میں منتقل کرنے کا ایک سلسلہ قائم کیا اور نامور ادیبوں کو اس جانب متوجہ کیا۔ اُن کی شدید خواہش تھی کہ کارل مارکس کی کتاب کو بھی اُردو میں منتقل کیا جائے۔ اُس عہد کے ایک نامور ادیب جو ترجمہ نگاری میں بھی طاق تھے، اس کام پر آمادہ ہوئے، مگر اس بھاری پتھر کو چوم کر چھوڑ دیا۔ قیام پاکستان کے بعد سید محمد تقی نے پچاس کے آخر میں اس مشکل ترین کتاب کو اُردو کا پیرہن عطا کیا اور اس کا سبب ایک ملاقات تھی۔

1955 میں سید محمد تقی نے مصر کے دارالحکومت قاہرہ میں عرب دنیا کے مشہور ادیب، مصنف اور انشاء پرداز ڈاکٹر طہٰ حسین سے گفتگو کی اور "داس کیپٹال" کا ذکر آیا اور اس کے ترجمے کی بات چلی اور یوں ساٹھ کے عشرے میں یہ کتاب منظر عام پر آئی۔ مولوی عبدالحق نے اس کام کی دل کھول کر پذیرائی کی۔ اس مشکل ترین کام کے بعد فلسفے پر تراجم کا سلسلہ جاری رہا۔ جو دیگر کتابیں منتخب کیں اُن میں "سائنس کا فلسفہ (مشہور انگریز ہیئت دان، ماہر طبیعیات اور ماہر ریاضیات، آرتھر ایڈنگٹن (1882-1944) کی کتاب کا ترجمہ)"، "پُر اسرار کائنات"، (مشہور برطانوی ماہر فلکیات، سرجیمس جینز (1877-1946) کی کتاب کا ترجمہ)، مشہور برطانوی سائنس دان اور نظریہ ارتقاء کو نیا موڑ دینے والے، چارلس ڈارون (1809-1882) کی کتاب "اصل انواع"، برطانوی ریاضی دان اور فلسفی، وائٹ ہیڈ (1861-1947) کی کتاب "مقاصد تعلیم" امریکی فلسفی اور مشہور ماہر تعلیم، جان ڈیوی (1859-1952) کی

کتاب ''جمہوریت اور تعلیم'' شامل ہیں۔

''تاریخ اور کائنات: میرا نظریہ'' (یہ کتاب اُن کی زندگی کا شاہکار قرار دی جاسکتی ہے، جس میں انہوں نے ایک ایسے مُربوط فلسفیانہ نظام کی بنیاد رکھی ہے جو انسانی ذہن میں پیدا ہونے والے سوالات اور معاشرے میں جنم لینے والے مسائل کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتا ہے)؛ ''منطق فلسفہ اور سائنس'' اور ''روح اور فلسفہ'' فلسفیانہ مباحث کے نئے در وا کرتی ہیں۔ سید محمد تقی کو پاکستان میں فلسفے کو اُردو زبان میں لوگوں تک پہنچانے والا پہلا فلسفی قرار دیا جاسکتا ہے۔

''پاکستان: پس منظر اور پیش منظر''، (اس کتاب پر مصنف کو آدم جی انعام'' سے بھی نوازا گیا) تحریک پاکستان کے اسباب و محرک سے بحث کرتی ہے۔ ''نہج البلاغہ کا تصور الوہیت'' حضرت علیؑ کے اُن افکار و جواہر پر مبنی پُر از حکمت خیالات ہیں جس میں خدائے لم یزال پر گفتگو کا ایک جہانِ معنی آباد ہے۔ Essays in Philosophy فلسفے پر تحریر کیے گئے انگریزی مضامین ہیں۔

A New Concept of the Universe وہ آخری کتاب تھی، جسے وہ تحریر کر رہے تھے اور جس کے ساڑھے آٹھ سو صفحات مکمل ہوئے تھے کہ دستِ اجل نے مصنف کے دستِ باکمال کو تھام لیا۔

''کربلا: تہذیب کا مستقبل'' جو اُن کی وفات کے بعد شائع ہوئی، اُن کے عالمانہ افکار کی آخری تحریری شکل قرار دی جاسکتی ہے۔

وہ بین الاقوامی فلسفہ کانگریس کے رُکن ہونے کے ساتھ تین برس اس کے صدر کے طور پر بھی کام کرتے رہے۔ اس دوران میں وہ مشہور برطانوی فلسفی برٹرینڈ رسل (1872-1970) سے بھی ملے۔ اس کے علاوہ سبرامنیان چندرا شیکھر (1910-1995) جنہیں اجرام فلکی پر کام کے سلسلے میں نوبل پرائز سے نوازا گیا، بھی اُن سے رابطے میں رہے۔

سید محمد تقی صحیح معنوں میں تخی ثابت ہوئے۔ انہوں نے تدبّر، تعقّل، فہم و فراست اور علم و دانش کی تقسیم کو وجہِ نشاط اور کارِ حیات جانا۔ کلامِ پاک کے لفظ اقراء کو حرزِ جاں بنانے والے سید محمد

تقی عمر بھر مطالعے میں مصروف رہے۔ معاشیات، سیاسیات، عمرانیات، الٰہیات، دساتیری نظام اور تنقید وہ مضامین تھے جو فلسفے کی معرفت مطالعے کا موضوع بنے۔ نابغۂ روزگار کی اصطلاح اُن پر صادق آتی ہے۔ کراچی میں گارڈن ایسٹ کے علاقے میں واقع رئیس اور تقی کی قیام گاہ شہر کا ایک ایسا ادبی و سماجی مرکز قرار پائی، جہاں ادبی، سیاسی، سماجی، مذہبی اور قومی اہمیت کی حامل ممتاز ترین شخصیات شرکت کرتیں اور علم سے سیراب ہوتیں۔

ممتاز محقق، ڈاکٹر ہلال نقوی نے "یادوں کی برات کے گمشدہ و غیر مطبوعہ اوراق" دریافت کیے ہیں، جس میں شاعرِ انقلاب، جوشؔ ملیح آبادی نے سید محمد تقی کے بارے میں لکھا ہے:

"اگر پاکستان بصارت سے محروم نہ ہوتا تو، ان کو، بہمہ وجوہ، مطمئن بنا کر، ان سے فقط علمی کام لیتا، اور دنیا کو دکھا دیتا کہ میرے تاج میں بھی سید محمد تقی کا سا کوہِ نور دمک رہا ہے"۔

آفتاب و ماہتاب صفت لوگوں کو پہچاننے والے معاشرے اور ممالک آج ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہیں۔ سید محمد تقی جیسے عالم و فاضل انسان اور دانشور کے افکار و جواہر سے فیضیاب ہونے کی صورت یہ تھی اُن کے کام کی ترویج کے لیے ادارہ قائم کیا جاتا، جامعات میں اُن پر تحقیقی کام کرایا جاتا اور اُن کے لیے گوشہ مختص کیا جاتا، مگر ان میں سے کوئی قدم بھی نہ اٹھایا گیا۔

آج اُن کی اٹھارویں برسی پر خیال آتا ہے کہ اُن کی یادوں کو تازہ کرنے کے لیے شاید ہمارے پاس وہ اٹھارہ افراد بھی نہ ہوں جو اُن پر قرینے سے کام کر سکیں۔

شوکت تھانوی: مزاح نگاری کا ایک روشن باب

(اُردو کے نامور ادیب، شوکت تھانوی 1909ء میں بنارس میں پیدا ہوئے اور 4 مئی 1963ء کو وفات پائی۔ اُن کا شمار اپنے عہد کی نابغۂ روزگار شخصیات میں ہوتا تھا۔ انہوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز بطور افسانہ نگار کیا۔ شاعری بھی کی، لیکن پھر مزاح نگاری کو وسیلۂ اظہار بنالیا، جو اُن کی شناخت ٹھہری۔ شوکت تھانوی کو ہم سے بچھڑے ہوئے 52 برس بیت گئے، لیکن اُن کی یادیں اور باتیں آج بھی ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ یہاں اُن کی برسی کے حوالے سے ڈاکٹر قمر عباس کا ایک مضمون شائع کیا جارہا ہے۔ ادارہ و جنگ)

ظرافت نگاری ایک ایسی وادی پُر خار ہے، جہاں قدم رکھنے سے پہلے اُس کے پُر پیچ راستوں اور سنگلاخ زمینوں کے بارے میں اچھی طرح غور وفکر کرلینا چاہیے۔ کبھی کبھی اس راہ پر چلنے والے ابتدا ہی میں نشانِ راہ گم کردیتے ہیں۔ کچھ وہ ہوتے ہیں، جو درمیان میں پہنچ کر ہمت ہار دیتے ہیں اور چند وہ لوگ ہوتے ہیں، جو منزل کے قریب پہنچ کر تھکن سے نڈھال ہو جاتے ہیں۔ مگر چند خوش نصیب ایسے بھی ہوتے ہیں، جو نہ صرف یہ کہ منزل پر شادکامی اور تازہ دمی کے ساتھ پہنچ جاتے ہیں، بلکہ راہ میں ایک ایسی مشعل لے کر چلتے ہیں، جس کی تابانی تھکے چہروں کی ویرانی اور بیابانی کو نئی زندگانی عطا کرتی ہے اور بلاشبہ اُن یگانہ روزگار ظرافت نگاروں میں شوکت تھانوی سرِفہرست ہیں۔ 1909 میں بنارس میں پیدا ہونے والے محمد عمر، پہلے بھوپال اور پھر مستقل طور پر لکھنؤ کے ادبی و علمی ماحول کا حصّہ بن گئے۔ ابتدائی تربیت میں نامور ادیب، مولانا ارشد تھانوی کا اہم کردار رہا اور شوکت نے اُن سے متاثر ہو کر اپنے نام کے ساتھ تھانوی کا لاحقہ اپنالیا۔ شوکت کی عملی زندگی کا آغاز صحافی کے طور پر ہوا۔ ''حسن ادب، لکھنؤ'' کی ادارت گویا سفر کا صحیح معنوں میں آغاز تھی، مگر کسی رُخ کو متعین کرنا اُس دور کے نامور صحافی سید جالب بخاری کے

روزنامہ "ہمدم" سے وابستگی کی بدولت ہوا۔ 1928 میں قائم ہونے والی جالب کی رفاقت ذہین شوکتؔ کے لئے رحمت ثابت ہوئی۔ "دو دو باتیں" کے عنوان سے اُن کے اخباری کالم کو پسندیدگی کی سند ملنے لگی۔ یہی وہ وقت تھا، جب شوکتؔ کی طبیعت افسانہ نگاری کی طرف مائل ہوئی۔ پہلا افسانہ "امرود کے چور" کے عنوان سے سامنے آیا۔ اس کے بعد بھی چند اور افسانے منظر عام پر آئے، تاہم "نیرنگ خیال" کے سالنامے میں اُن کے تحریر کئے گئے افسانے "سودیشی ریل" نے راتوں رات شوکت کو برصغیر کے نامور مزاح نگاروں کی فہرست میں جگہ دلوادی۔ یہ افسانہ بنیادی طور پر اس خیال کے تحت لکھا گیا تھا کہ فرنگی سے آزادی ملنے کے بعد جب ہندوستان میں مقامی راج قائم ہوگا تو اس میں ہندوستان میں چلنے والی ریل گاڑیوں کا کیا حال یا حشر ہوگا؟ یہی افسانہ اُن کی پہچان اور شان کا باعث بنا۔ شوکتؔ نے جب لکھنے کا آغاز کیا تو مزاح نگاری کے اُفق پر کئی نام چودھویں کے چاند کی طرح روشن تھے۔ پطرسؔ، رموزیؔ، رشیدؔ احمد صدیقی اور عظیم بیگ چغتائی اپنی زندہ تحریروں کے ساتھ جگمگا رہے تھے۔ پطرسؔ مغربی طرز کی مزاح نگاری، رموزیؔ الفاظ اور فقروں کے ظاہری معنوں سے پرے رہ کر، پروفیسر رشیدؔ احمد صدیقی فلسفیانہ مزاح اور عظیم بیگ چغتائی پلاٹ یا واقعات کے بُنت کے ذریعے مزاح کے عنصر کو سامنے لا رہے تھے۔ اس کے علاوہ بھی چند اور نامور افراد مزاح نگاری کی قندیل لئے ہوئے برصغیر کی اُداس راتوں کو اپنی تحریروں سے منور کرنے کی لگن میں مگن تھے۔ ایسے میں شوکتؔ کا اُس منظر نامے میں آنا اور اُن سب پر چھانا اُن کے کمالِ فن کا بیّن ثبوت ہے۔ شوکتؔ نے اوّل شاعر ہونے کی وجہ سے، فطرت کا مطالعہ اُس کی جزئیات میں اتر کر کیا تھا اور دوم، طبیعت کی شوخی اور ظرافت فطرت میں متانت کو ٹھہرنے ہی نہیں دیتی تھی، لہٰذا اُن کی تحریر کھلنڈرے پن کی کیفیت کی عکاسی کرتی نظر آنے لگی اور طبیعت کا یہی کھلنڈرا پن اور برجستگی اُن کا اُسلوب قرار پایا۔ چونکہ شوکتؔ کے یہاں کہانی ارد گرد کی زندگی کے چلتے پھرتے کرداروں سے کشید کی گئی تھی، اس لئے اُن کے یہاں فقرے تازہ و توانا ہیں۔ شوکتؔ نے زندگی، پژمردگی اور بے دلی سے نہیں، بلکہ شگفتگی اور ہمہمی کے ساتھ بسر کی اور بالکل یہی بود و باش تحریر میں بھی در آئی۔ شوکتؔ کے حلقے کے لوگ اُن کے صحبت میں رہنا اس لئے

ضروری سمجھنے لگے کہ اُس سے وہ روز مرہ کی گُلفتوں سے نجات اور بات ہی بات میں مزاحیہ نکات سے محظوظ ہونے لگے۔ شوکتؔ طنز پر نہیں، بلکہ مزاح پر یقین رکھتے تھے اور مزاح بھی تہذیب کے دائرے میں۔ چونکہ عمر کا بیشتر وقت لکھنؤ میں گزارا، لہٰذا یہاں کی بود و باش اور صحبتوں نے زبان میں محاورہ، روز مرہ، شستہ، رواں اور سلیس طرزِ بیان میں طاق کر دیا۔ شوکتؔ کا تحریر کردہ ریڈیو سے ہفتہ وار فیچر ''منشی جی'' نشر ہوتا تھا، جس میں کسی سماجی برائی یا کسی اور اہم موضوع پر دلچسپ بحث ہوتی تھی۔ یہ سلسلہ کئی برس چلتا رہا۔ یہ اتنا کامیاب فیچر رہا کہ برِّ صغیر کی ممتاز ترین ناول نگار اور افسانہ نگار، قرۃ العین حیدر اس کی شیدائی تھیں۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد شوکتؔ تھانوی نے یہی سلسلہ ریڈیو پاکستان پر بھی متعارف کرایا، تاہم اس مرتبہ لکھنؤ ریڈیو کے منشی جی ''قاضی جی'' کا روپ اختیار کر چکے تھے۔ شوکتؔ نے تقسیم ہند سے کچھ قبل لاہور کی پنچولی فلم کمپنی سے بطور مکالمہ نویس اچھے معاوضے پر خدمات انجام دیں۔ یہاں انہوں نے امتیاز علی تاجؔ کی رفاقت میں کام کیا اور ایک فلم کے لئے اداکاری بھی کی۔ درج بالا سطور میں کہیں اس بات کا اظہار کیا جا چکا ہے کہ شوکتؔ کو شعر و شاعری سے بھی خاص شغف تھا اور انہوں نے اس عنوان سے بہت کچھ کہا بھی۔ اس میں مزاحیہ کلام بھی تھا اور سنجیدہ شاعری بھی۔ مذہبی عنوان سے کہا گیا کلام بھی تھا اور پیروڈی بھی۔ غرض تخلیق اظہار کی راہ خود تلاش کرتی تھی۔

ہوس جس کو سکھا دے، طالبِ دیدار ہو جانا
اُسے کیا آئے گا، محوِ خیالِ یار ہو جانا

موت برحق تھی، مگر کاش نہ آتی شبِ غم
یہ تو کہنے کو نہ ہوتا، کہ اک ارماں نکلا

سچ ہے، اُن کو مجھ سے کیا، اور میرے افسانے سے کیا
کر دیا دیوانہ، تو اب کام، دیوانے سے کیا

شوکت نے صنفِ مرثیہ کو بھی اپنایا۔ اُن کے مرثیے کا اوّلین بند کچھ یوں ہے

آ اے قلم، کہ تجھ کو سعادت عطا کریں
جنبش میں تجھ کو لائیں، ترا حق ادا کریں

جس غم میں مبتلا ہیں، تجھے مبتلا کریں
تیری زباں سے ذکرِ شہِ کربلا کریں

ذکرِ حسینؓ اصل میں ذکرِ رسولؐ ہے
یہ وہ مماثلت ہے جو سب کو قبول ہے

شوکت تھانوی روزنامہ جنگ سے بھی وابستہ ہوئے۔ اخبار کے لئے اُن کا پہلا کالم 17 اگست 1957 کو لکھا گیا۔ "وغیرہ وغیرہ" کے عنوان سے لکھا جانے والا یہ سلسلہ "پہاڑ تلے" اور پھر "دخل در معقولات" کے نام سے بھی جاری رہا۔ اخبار سے اُن کی وابستگی اُن کی وفات 4 مئی 1963 تک برقرار رہی۔ شوکت کی تصانیف میں "موجِ تبسم"، "سحرِ تبسم"، "سیلابِ تبسم"، "طوفانِ تبسم"، "دنیائے تبسم"، "مضامینِ شوکت"، "بارِ خاطر"، "قاعدہ بے قاعدہ"، "شیش محل"، "مابدولت" وغیرہ شامل ہیں۔ 27 مئی 1963 کو روزنامہ جنگ میں اُن پر لکھے گئے تاثراتی مضمون میں، عہدِ جدید کے ممتاز ترین شاعر، فیض احمد فیض نے تحریر کیا:

"اُن کی ذہین اور بوقلموں شخصیت نے جولانیٔ طبع کے لئے جو بھی میدان منتخب کیا اس میں یکساں جوہر دکھائے۔ نظم، نثر، تمثیل، افسانہ، شخصیت نگاری، ڈرامانویسی، ریڈیو، صحافت، بذلہ سنجی، بدیہہ گوئی۔ اُن کی طبع رواں، زبان اور قلم یکساں، ہر میدان میں یکساں طراری سے رواں رہتے۔ اُن کی ظرافت میں تکلف اور آورد کو دخل نہ تھا۔ بے تکلف اور بے تکان جیسے بولتے ویسے لکھتے۔ نہ گفتار میں ان کی طبع کو غیر حاضر پایا نہ تحریر میں کبھی انہیں قلم پر زور دیتے دیکھا اور اس مشاقی کا راز ریاضت نہ تھی۔ ان کی خداداد ذہانت تھی، جو اکتساب کی محتاج نہیں ہوتی"۔

''اُداس نسلیں'' کا خالق: عبداللہ حسین

عبداللہ حسین کے انتقال کے ساتھ ہی ایک عہد تمام ہوا، ایک ایسا عہد، جس میں ''اُداس نسلیں'' تحریر کیا گیا۔ تقسیم ہند کے بعد تحریر کیے گئے ناولوں میں قرۃ العین حیدر کے ''آگ کا دریا'' کے بعد جس ناول کو وقار اور اعتبار حاصل ہوا، وہ عبداللہ حسین کا ''اُداس نسلیں'' ہے۔ اوّل الذکر ناول کی مصنفہ ایک مضبوط ادبی پس منظر کی مالک تھیں۔ سجاد حیدر یلدرم اور نذر سجاد کی دختر ہونے کے ناتے قرۃ العین حیدر کو ''آگ کا دریا'' جیسا ادبی سنگِ میل عبور کرنا ہی تھا۔ اُس شاہکار ناول سے پہلے ہی قرۃ العین حیدر ادبی افق کو اپنی تابانیوں سے منور کر چکی تھیں۔ ''میرے بھی صنم خانے''، ''سفینۂ غمِ دل'' اُردو ادب کے متوالوں کے دروں پر دستک دے چکے تھے۔ گجرات، پنجاب کے ایک چھوٹے زمیندار اور ایکسائز انسپکٹر کے گھر 1931 میں پیدا ہونے والے محمد خان نے ابتدائی تعلیم کی منازل طے کرنے کے بعد ثانوی تعلیم کے طور پر سائنس کو بطور مضمون اختیار کیا۔ 1952 میں گجرات سے بی ایس سی کیا اور جب وہ عبداللہ حسین کے نام سے ادبی دنیا میں داخل ہوئے تو پس منظر میں ٹھوس ادبی حوالے کی جگہ پتھریلی سیمنٹ فیکٹری اور کیمیکل کی سائنسی فضا تھی، جو کینیڈا تک اُن کی ہم رکاب رہی کہ جہاں سے اُنہوں نے کیمیکل انجینئرنگ میں ڈپلومہ حاصل کیا۔ یہ تو اُن کی معاشی تگ و دو کا احوال تھا۔ اُدھر جب وہ ادب کی سمت آئے تو محمد خان کو عبداللہ حسین سے اس لئے بدلنا پڑا کہ کرنل محمد خان ادب کی دنیا میں طنز و مزاح کے پھول برسا رہے تھے۔ ہجوم سے گریزاں اور کم سخن عبداللہ حسین اپنی فکر کے دریچے پر آ کر گھنٹوں اور بے تکان بولتے، جہاں وہ خود سامع اور خود مقرر ہوتے اور گفتگو کا محور عصری مسائل ہوتے۔ یہی وہ وقت تھا کہ اُن کے اندر کا بے چین اور آوارہ خیال انسان اُن کو دور کہیں ماضی کے پُر آشوب دور میں لے جاتا اور وہ انسانی جبر کے ہاتھوں دوسرے انسان کی بے بسی اور بے چارگی کا نظارہ کرتے۔ یہ سب اُنہیں اُداسی اور دکھ کے گہرے سمندروں میں لے جاتا اور وہ اُس سے باہر نکلنے کے

لیے تدبیریں سوچا کرتے۔ رفتہ رفتہ یوں ہوا کہ خیال نے ایک مربوط شکل اختیار کی۔ وہ اُس جبر کے زمانے کو انفس و آفاق پر محیط جاننے لگے، اور یہ طے کیا کہ اس جبر کا اگر خاتمہ نہ کر سکے تو کم از کم اجاگر تو کرنا ہی چاہیے۔ یوں اُن کا ذہن جبر کے لامتناہی زمانے کو سمیٹ کر ایک متعین شکل دے بیٹھا۔ تاہم منزل ابھی دُور تھی۔ اپنی ملازمت کی زندگی کی بے رنگی کو رنگ آمیز بنانے کے لئے عبداللہ حسین نے مشاہدے کا مضبوط ہتھیار اپنے ہاتھ میں لیا اور کامل پانچ برس ایک پلاٹ ترتیب دیتے رہے، جو پہلی عالمگیر جنگ سے تقسیم ہند تک کے دور کا احاطہ کرتا تھا اور یوں اُس پورے دور کی ''اُداس نسلیں'' عدم سے وجود کے پیرہن میں سمٹ آئیں۔ اب اگلا مرحلہ اُس کی اشاعت کا تھا۔ ایک گمنام مصنف کی تحریر کو کوئی ادارہ بھی اپنا نام دینے کو تیار نہ تھا۔ مسابقت کا زمانہ تھا اور اشاعتی ادارے مشہور و معروف شاعروں اور ادیبوں کی نگارشات سے اپنے کاروباری معاملات کو فروغ دیتے۔ بالآخر ایک نئے مصنف کے لئے ایک ''نیا ادارہ'' سامنے آ ہی گیا۔ تاہم اس کی صورت یہ نکالی گئی کہ مصنف سے کہا گیا کہ ادبی دنیا میں اپنی آمد کی اطلاع کے طور پر کوئی مضمون شائع کرائے اور یوں ''ندی'' کے نام سے لکھی گئی مختصر کہانی رسالہ ''سویرا'' میں شائع ہوئی۔ 1963ء میں ''اُداس نسلیں'' نے شائع ہوتے ہی ادبی دنیا میں تہلکہ مچا دیا اور راتوں رات عبداللہ حسین شہرت کے بام عروج پر پہنچ گئے۔ پہلی تحریر کی یہ غیر معمولی پذیرائی بلاشبہ عبداللہ حسین کا ایک ادبی معرکہ سر کرنے کے مترادف تھی۔ اس ناول پر عبداللہ حسین کو ''آدم جی ایوارڈ'' سے نوازا گیا۔ ناول کی اشاعت کے بعد عبداللہ حسین نے رختِ سفر باندھا اور انگلینڈ میں سکونت اختیار کی۔ 1981ء میں دو ناولوں اور پانچ کہانیوں پر مشتمل اُن کا مجموعہ ''نشیب'' منظر عام پر آیا۔ اُس کے بعد ''باگھ''، ''قید''، ''رات''، ''نادار لوگ'' اور ''فریب'' شائع ہوئے۔ ان تمام تحریروں کو بھی ادب کے متوالوں نے بے حد سراہا۔ ''اُداس نسلیں'' عبداللہ حسین کی شناخت بن گیا، اگرچہ اس کے کچھ حصوں پر سرقے کا الزام بھی لگایا گیا۔ قرۃ العین حیدر نے ''کارِ جہاں دراز ہے'' میں ناول کے اُن حصوں کی نشان دہی بھی کی، جو ''آگ کا دریا'' سے سرقہ کئے گئے تھے، تاہم اس سے ''اُداس نسلیں'' کی شہرت و مقبولیت پر کوئی اثر نہ پڑا۔ شاہ کار تحریر وقت سے ماوراء اور سرحد سے بے پرواہ ہوتی ہے۔ اُردو ادب کی صفِ ناول نگاری عبداللہ حسین کو ''اُداس نسلیں'' کی بدولت بالکل اسی طرح یاد رکھے گی، جس طرح قرۃ العین حیدر کو ''آگ کا دریا'' کے باعث یاد رکھا جائے گا۔

برصغیر کے ممتاز شاعر: فانؔی بدایونی

اُن کی شاعری درد اور یاس کا گہرا احساس ہے

ناکام ہے تو کیا ہے، کچھ کام پھر بھی کر جا
مردانہ وار جی اور، مردانہ وار مر جا

اس شعر کے خالق کا تصور کر کے ایک ایسے شاعر کا خیال آتا ہے، جس نے زندگی کے مصائب وآلام کو پرکاہ کے برابر بھی اہمیت نہ دی ہوگی اور حوادثِ حیات کو کارِ نشاط جانا ہوگا، مگر ایسا ہرگز نہیں ہے۔ اس شعر کا خالق سرتاپا رنج ومحن میں ڈوبا اور حزن وآلام میں اترا ایسا شخص ہے، جسے شعروادب کی دنیا میں فانؔی بدایونی کے نام سے جانا اور پہچانا جاتا ہے اور جسے اُردو کے نامور ادیب، پروفیسر رشید احمد صدیقی نے "یاسیت کا امام" قرار دیا۔ یوں فانؔی کی خاصیت اُن کی یاسیت بنی۔ یوپی (انڈیا) کی ریاست بدایوں کے ایک خطّے اسلام نگر میں شجاعت علی خان کے گھر میں 1879 میں پیدا ہونے والے جس بچے کا نام شوکت علی رکھا گیا، اُس کے بارے میں ماں باپ یہ گمان بھی نہ کر سکے ہوں گے کہ آگے چل کر یہ بچہ اُردو شاعری میں فانؔی بدایونی کے نام سے ایک اختصاصی لہجے کا حامل بنے گا۔ 1901 میں بریلی کالج سے گریجویشن کرنے کے بعد فانؔی نے مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں داخلہ لیا اور 1906 میں وہاں سے ایل ایل بی کی سند حاصل کی۔

تعلیمی میدان میں توقیر پانے والے فانؔی نے ابتدائی برسوں میں شیکسپیئر اور ملٹن کی نگارشات کو اُردو میں ڈھالنے کا معرکہ بھی سر کیا۔ 1931 میں ایک رسالہ بھی جاری کیا جو کچھ ہی عرصے بعد مالی بحران کا سامنا کرنے کے باعث بند ہوگیا۔ رئیس خاندان سے تعلق رکھنے کے باوجود فانؔی تک آتے آتے ریاستی زمینیں وسعت اور وقعت سے محروم ہوگئیں۔ اس میں کچھ دوش فانؔی کے طرزِ حیات

کا بھی تھا۔ زندگی کے آلام ہر گام اُن کے ہم رکاب رہے۔ فانی نے جب حاصل کی گئی تعلیم کو بطور پیشہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تو دہلی، لکھنؤ اور پھر آگرہ کی عدالتوں میں قانونی معاملات کو کارِ زندگی کے معمولات میں مدغم کر دیا۔ یہ سلسلہ شادکامی کے بجائے ناکامی کی طرف جانے لگا اور گمان کیا جا سکتا ہے کہ ایسا ہونا ہی تھا، کیوں کہ فانی قانونی موشگافیوں کے نہیں بلکہ قافیوں کے آدمی تھے۔ قسمت فانی کو حیدرآباد دکن لے آئی۔ وہ دکن جہاں شعر و ادب کی حکمرانی تھی اور جو گویا مہاراجا کشن پرشاد شاد کی راج دھانی تھی۔ مہاراجا خود اچھے شاعر اور اُردو کے عاشق تھے۔ انہوں نے فانی کو محکمۂ تعلیم میں پروانۂ تقرر عطا کر دیا۔ اگرچہ مہاراجا کی خواہش تھی کہ فانی بطور منصف فرائضِ منصبی ادا کریں۔ کیونکہ فانی کے پاس قانون کی سند تھی۔ مگر فانی نے اسے قبول نہ کیا، کیونکہ اُن کے نزدیک جائے ادب زیادہ مستند تھی۔ فانی کسبِ معاش کی خاطر دن کے اوقات میں اسکول میں ملازمت کرتے اور شام ڈھلے معظم جاہ کی عدالت کے چند امور انجام دیتے۔ یہ سخت معاشی تگ و دو کچھ یوں اثر انداز ہونے لگی کہ ایک دن اسکول کے اوقات میں فانی کی آنکھ لگ گئی۔ ذرا کی ذرا بات کا بتنگڑ بنا دیا گیا اور ملازمت سے برخاستگی کی باتیں ہونے لگیں، تاہم وہ وقت بھی گزر گیا۔ معظم جاہ کی عدالت فانی کو اتنی بھائی کہ وہ دورانِ قیامِ دکن اُسی سے وابستہ رہے۔ اُس وابستگی کے دنوں کے ساتھی جوش ملیح آبادی، صدق جائسی اور ماہر القادری بھی تھے۔ جوش سے فانی کو خاصی قربت رہی۔ جوش نے جب فانی کے ساتھ ایام روز و شب گزارے تو اُن پر فانی کی غم پسند زندگی آشکار ہوئی، جسے دیکھ کر خود جوش کی طبیعت بہت بے قرار ہوئی اور وہ فانی کو "بیوۂ عالم" اور "اُمّ الحزن" کہہ کے یاد کرنے لگے۔ خود فانی کو جوش کی صحبت سے ایسی رغبت ہوئی کہ بے ساختہ پکار اٹھے

کون غربت میں، غم گسار غریب
کس کو پردیسیوں کے کام سے کام
جوش و آزاد نے کسی حد تک
کی تلافیِ گردشِ ایّام

تاہم، تلافیِ گردشِ ایام فانی جیسے آرزوئے تشنہ کام کے لئے اسپ بے لگام تھی۔ زندگی اور زمانہ فانی کے لئے ہمیشہ سرمایہ و بیگانہ رہا۔ وہ زندگی اور وہ زمانہ جس نے کسی کو دولت، کسی کو عزت، کسی کو راحت اور کسی کو شہرت دی۔ جب فانی کی طرف آیا تو دینے کو جو چیز رہ گئی، وہ تھی غم و کلفت۔ انیسویں صدی میں پیدا ہونے والے فانی عمر کے انیسویں برس تک اپنے دل میں لگی آگ کو سرد کرنے کے لئے اشعار کی صورت میں ایک دیوان مرتب کر چکے تھے، مگر باپ نے اُس شعری آگ کو حقیقی آگ کے شعلوں کی نذر کر دیا۔ بیسویں صدی غم پسند فانی کے ساتھ مزید ستم رسیدگی پر اتر آئی۔ وقت برصغیر کے لئے سیاسی اور ملی لحاظ سے فیصلہ کن موڑ پر آ چکا تھا۔ سخنوری کے تلاطم خیز بحر میں اقبالؔ اور جوشؔ اپنے کام اور کلام سے لہروں میں ایسا تموج پیدا کر رہے تھے کہ جس کے ارتعاش سے لوگوں کے دلوں میں ایک ہلچل تھی جو مسلسل تھی۔ اُن کے شعری نغمے اور استعارے دلوں میں آزادی کے شرارے پیدا کر رہے تھے۔ ایسے میں کسی غم نصیب کے نوحے کو سنتا تو کون سنتا۔ مگر فانی اپنی بے سروسانی کے بجائے اپنے سوزِ نہانی کو ہتھیار اور گلے کا ہار بجھ کر شاعری کی زبان میں کچھ ایسے گویا ہوئے کہ اُن کی قوتِ گویائی اُن کو خوب راس آئی۔ اُس دور کی ہنگامہ خیزیوں کو شاعری میں بغیر پروئے اور صرف اپنے غموں کو روئے فانی لافانی ثابت ہوئے۔ اُردو کے ممتاز ترین نقادوں میں سے ایک، مجنوں گورکھ پوری کا کہنا ہے ''ہم اپنی دنیا سے بے خبر ہو کر فانی کی پیدا کی ہوئی دنیا میں کھو جاتے ہیں اور ہم کو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ تو بالکل ایک نیا عالم ہے جہاں بڑے امن اور اطمینان کے ساتھ پناہ لی جا سکتی ہے''۔

اگرچہ فانی کو زندگی میں بہت سے دکھوں کا سامنا کرنا پڑا، مگر شدید تر دُکھ جوان بیٹی کی موت تھی، جس کو وہ عمر کی آخری منزل تک سہتے رہے۔ آنکہ اگست 1941 میں انتقال کر گئے۔

ہر نفس عُمرِ گزشتہ کی ہے میّت فانی
زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا

فانیؔ ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
قید بھی جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

فانیؔ بس اب خدا کے لئے ذکرِ دل نہ چھیڑ
جانے بھی دے، بلا سے رہا یا نہیں رہا

میں نے فانیؔ ڈوبتے دیکھی ہے نبضِ کائنات
جب مزاجِ یار کچھ برہم نظر آیا مجھے

تم جوانی کی کشاکش میں کہاں بھول گئے
وہ جو معصوم شرارت تھی، حیا سے پہلے

کوئی چٹکی سی کلیجے میں لیے جاتا ہے
ہم تری یاد سے غافل نہیں ہونے پاتے

لو مسیحا نے بھی، اللہ نے بھی یاد کیا
آج بیمار کو ہچکی بھی، قضا بھی آئی

☆☆☆☆☆

فیض احمد فیض

شعری تہذیب میں رجائیت پسندی کی آواز

ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیضؔ گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

اپنی شخصیت کے ظاہری اور باطنی استحکام پراور اپنے طرزِ بیان اور کلام پر اتنا تیقن یقیناً فیض ہی کو زیب دیتا ہے کہ جو اگر تقسیم سے قبل برِ صغیر میں مقبولیت کی منزل پر تھے، تو تقسیم کے بعد محبوبیت کی منزل پر آ گئے۔ عوام و خواص میں اتنی پذیرائی کہ جہاں گئے جانِ محفل اور نشانِ منزل قرار پائے۔

ساٹھ کے عشرے کے دوسرے وسط میں جب پاکستان اور بھارت کے سفارتی تعلقات جنگ کے بعد نچلی ترین سطح تک پہنچے تو روس میں ہندوستان کے وزیرِ اعظم لال بہادر شاستری اور پاکستان کے صدر ایوب خان کی ملاقات کا اہتمام کرایا گیا۔ چنیدہ شخصیات اس کمرے میں دونوں متذکرہ حضرات کے ساتھ موجود تھیں اور بیان کیا جاتا ہے کہ جب فیضؔ اُس کمرے میں داخل ہوئے تو تمام ہندوستانی صحافی احتراماً اپنی نشستوں سے کھڑے ہو گئے۔ اُس وقت کی سخت کشیدہ فضا میں ہندوستانی صحافیوں کا ایک پاکستانی کے لیے کشادہ دلی کا مظاہرہ اُس شخصیت کی غیر معمولی حیثیت کا واضح اظہار تھا۔ یہ احترام اور مقام ہمیشہ فیضؔ کے پابہ رکاب اور بہت سے شعراء کے لیے سدا خواب رہا۔

غالبؔ اور کسی حد تک اقبالؔ کو بھی اُن کی حیات کے بعد صحیح تر مفہوم میں حیاتِ نو عطا ہوئی۔ لوگ اُن کی شاعری کی تعبیر کی تدبیر میں منہمک ہو گئے، کلام کی شرحیں مرتب کی جانے لگیں اور یہاں

تک ہوا کہ اُردو ادب میں غالبیات اور اقبالیات نصاب کی ضروریات میں شمار کیے جانے لگے۔

فیض یوں خوش نصیب رہے کہ زندگی ہی میں عوام اور خواص اُن کو سر آنکھوں پر بٹھاتے اور اُن کی شخصیت کی دل نوازی کے گُن گاتے رہے۔

ضلع نارووال، پنجاب میں بیرسٹر سلطان محمد خان کے گھر 13 فروری 1911 کو پیدا ہونے والے بچّے کا نام فیض رکھا گیا۔ فیض کے پردادا سے شروع ہونے والی سربلندی فیض تک آتے آتے سرافرازی کی منزل تک پہنچ گئی۔ فیض کے پردادا، سربلند، جب کہ دادا صاحبزادہ خاں تھے۔ والد سلطان بخش تھے، جو بعد میں سلطان محمد خاں کے نام سے مشہور ہوئے۔ دادا اتنے غریب کہ بیٹے کو تعلیم دلانے تک کے پیسے سے محروم، مگر بیٹا علم کی لگن لیے گگن کے نیچے مویشی چرانے کے کام میں منہمک رہتا۔ ایک دن سلطان خاں کی حصولِ علم کی سچی طلب کو دیکھ کر استاد نے کلاس میں بیٹھنے کی اجازت دے دی۔ بس اُس کے بعد سلطان منزلوں پر منزلیں طے کرنے لگا۔

مڈل کے امتحان میں امتیازی حیثیت سے کامیابی کے بعد قدرت نے آگے پڑھنے اور بڑھنے کی سبیل بھی پیدا کر دی۔ مسجد کے حجرے میں رہتے ہوئے تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ سلطان خاں نے انگریزی اور فارسی میں بھی مہارت حاصل کر لی۔ اُن ہی دنوں افغانستان کا قونصلر سردار امیر محمد خاں ہندوستان آیا ہوا تھا۔ جمعے کی نماز میں پہنچا تو سلطان خاں سے بھی ملاقات ہوگئی۔ سلطان نے فارسی میں کلام کر کے اسے بہت متاثر کیا۔ جاتے ہوئے وہ سلطان کو بھی اپنے ساتھ افغانستان لے گیا اور شاہ افغانستان کے دربار میں مترجم کے عہدے پر فائز کرا دیا۔ یہاں سے وابستگی مالی منفعت کی بنیاد قرار پائی، مگر حاسدوں نے سازشیں شروع کر دیں اور سلطان کو وہاں سے نکلنا پڑا۔ کسی طرح لاہور پہنچا، مگر برطانوی حکومت کی شکایت پر گرفتار کر کے لاہور کے قلعے میں نظر بند کر دیا گیا۔ تاہم قیامِ افغانستان میں بنائے گئے ایک برطانوی دوست کی وساطت سے قید سے رہائی ملی۔ اُس خاتون دوست نے سلطان کو برطانیہ منتقل ہونے میں بھی مدد دی۔

کیمبرج میں داخلہ لیا اور کچھ وقت بعد ''فیلو آف رائل جیوگرافیکل سوسائٹی'' کا منصب مل گیا۔ امیر افغانستان کو علم ہوا تو سفیر کا عہدہ پیش کیا، جسے سلطان نے قبول کر لیا۔ کیمبرج کے بعد

بیرسٹری میں داخلہ لیا تو اقبالؔ، سر عبدالقادر، سر فضل حسین، سر شفیع بھی حصول تعلیم کے لیے وہاں موجود تھے، جن سے دوستی رہی۔ لندن کی اونچی سوسائٹی سے ربط و ضبط معمول کی بات قرار پائی۔ ڈیوک آف ونڈسر کے ساتھ پولو کھیلنا بھی اُن دنوں کا ایک مشغلہ بن گیا۔ اب دولت، شہرت، منصب سلطان کی پہچان بن گیا۔ وہی سلطان جسے ایک وقت میں دو وقت کی روٹیاں بھی بھاری پڑتی تھیں۔

بالآخر لندن سے واپسی کا سفر اختیار کیا اور پہلے جہلم اور پھر سیالکوٹ کو مسکن بنایا۔ وکالت کا آغاز ہوا اور اُس سے بھی خوشحالی کا ایک دور دیکھا، تا آنکہ 1931 میں انتقال ہو گیا۔ اُس وقت فیضؔ کالج میں زیر تعلیم تھے۔ باپ نے زندگی کی کلفتوں کا سامنا کرنے کے باوجود علم سے منہ نہ موڑا اور اُس کی یہی ادا بیٹے کو اتنی پسند آئی کہ اُس نے تہیہ کر لیا کہ وہ بھی پرورشِ لوح و قلم کو زندگی کا مقصدِ اولیٰ قرار دے گا۔ تاہم والد کا انتقال زیست کی عشرت کو عسرت میں بدل گیا۔

قرض خواہوں کو ادائیگی کا وقت آیا، جائیداد کا جھگڑا شروع ہوا، مقدمے بازی کی نوبت آئی اور فیضؔ ان باتوں سے رنجور اور مناقشوں اور تنازعوں سے دور ہو گئے۔

ابتدائی تعلیم مشرقی تہذیب و تربیت کی مکمل عکاس تھی۔ حفظِ قرآن سے شروع ہونے والا سفر مولوی ابراہیم سیالکوٹی کے مکتب تک پہنچا، جہاں سے عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد اسکاچ مشن ہائی اسکول سے 1927 میں فرسٹ ڈویژن میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ مرے کالج، سیالکوٹ سے فرسٹ ڈویژن میں انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں کامیاب ہوئے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب فیضؔ نے اقبالؔ کے استاد، شمس العلماء مولوی سید میر حسن سے عربی و فارسی کی مزید تعلیم حاصل کی۔

1931 میں فیضؔ نے گورنمنٹ کالج، لاہور سے گریجویشن اور پھر عربی میں بی اے آنرز کیا۔ 1933 میں اسی کالج سے انگریزی میں ایم اے اور 1934 میں اورینٹل کالج، لاہور سے ایم اے، عربی کی سند حاصل کی۔ تھوڑے ہی عرصے بعد ایم اے او کالج، امرتسر میں شعبہء انگریزی میں لیکچرار ہو گئے۔ 1940 میں ہیلی کالج، لاہور میں انگریزی کے استاد کے طور پر مامور ہوئے۔

یہ تو تعلیمی ونصابی واکتسابی سفر کا احوال تھا اور ادب کی صورت اور کیفیت یہ تھی کہ نوعمری ہی میں اردو اور انگریزی ادب سے شناسائی پیدا ہوئی ۔سیالکوٹ میں گھر سے متصل حویلی میں مشاعرے ہوتے ۔پنڈت راج نرائن ارمان مشاعرے کے انتظامات سنبھالتے اور علامہ اقبال کے دوست ،سراج الدین صدارت کیا کرتے ۔فیض اُس وقت دسویں جماعت کے طالب علم تھے اور جب شوق کے تحت کچھ اشعار کہنے شروع کیے تو سراج الدین نے سختی سے منع کر دیا۔تاہم شعر کی الفت فیض سے سنگت کا تقاضا کرنے لگی تھی ۔مرے کالج ،سیالکوٹ میں پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے مصرعہ طرح پر شعر کہنے کا سلسلہ شروع کیا تو فیض کی آتش شوق کو گویا مہمیز مل گئی ۔تاہم گورنمنٹ کالج ،لاہور وہ مقام تھا جہاں سے فیض صحیح معنوں میں فیض یاب ہوئے۔

پطرس بخاری جیسی شخصیت نے فیض پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ڈاکٹر دین محمد تاثیر،صوفی تبسم ،امتیاز علی تاج ،چراغ حسن حسرت ،حفیظ جالندھری ،اختر شیرانی غرض ادبی ستاروں کی ایک کہکشاں تھی ۔تاہم باقاعدہ طور پر شہرت کا آغاز اُس وقت ہوا جب 1928 میں مرے کالج میں ''اخوان الصفا'' کے تحت منعقدہ مشاعرے میں غزل کہی ،جس کا مطلع تھا۔

لب بند ہیں، ساقی مری آنکھوں کو پلا دے
وہ جام، جو منت کشِ صہبا نہیں ہوتا

1929 میں فیض نے لاہور ریڈیو کے لیے ڈرامے لکھے ۔جن ڈراموں کو مقبولیت حاصل ہوئی ان میں ''پرائیوٹ سیکریٹری''، ''سانپ کی چھتری'' اور ''تماشا مرے آگے'' شامل ہیں۔

امرتسر کے ایم اے او کالج کے زمانہ وتدریس کا قصہ ہے کہ جب صاحبزادہ محمود الظفر وائس پرنسپل کے عہدے پر فائز تھے اور اُن کی بیگم ،رشیدہ جہاں ادبی دنیا میں قدوقامت کی حامل ہو چکی تھیں کہ 1935 میں لندن میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا اجلاس ہوا اور منشور مرتب کیا گیا۔منشور کی نقل محمود الظفر کو بھیجی گئی ۔فیض نے بھی اسے بنظرِ غائر پڑھا اور اُس پر صاد کیا۔

اگلے برس یعنی 1936 میں سجاد ظہیر خود امرتسر آئے اور محمود الظفر اور فیض کے ساتھ لاہور

پہنچے۔ اگلے دن میاں افتخار الدین کی کوٹھی پر منعقدہ جلسے میں چراغ حسن حسرت، میاں بشیر احمد، عبدالمجید سالک، وقار انبالوی، صوفی تبسم اور دیگر ادب دوست اصحاب نے شرکت کی۔ صوفی تبسم کو انجمن کا سیکریٹری منتخب کیا گیا، یوں ہندوستان میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد عمل میں آئی۔ فیض کو پنجاب شاخ کا سیکریٹری منتخب کیا گیا۔

1938 میں "ادب لطیف" کے ایڈیٹر ہوئے۔ زمانہ شورش اور ہنگاموں کی زد میں تھا۔ اقتصادیات نے سماجیات کو کوسوں پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ خود ہندوستان کی معیشت مقامی افراد کو اذیت میں مبتلا کر رہی تھی۔ ایسے میں دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہو چلا۔ ہٹلر اور مسولینی دنیا کو جہنم بنانے پر تلے تھے۔ اُدھر فیض اور اُن کے ہم خیال ترقی پسندانہ سوچ اور فکر کے تحت دنیا کو جنت بنانے کی لگن میں مگن تھے۔

روس اُس زمانے میں دنیا کا واحد سوشلسٹ ملک تھا۔ دنیا بھر کے مزدوروں کی آزادی کا پرچم روس کے ہاتھ میں تھا اور اعلیٰ انسانی آدرشوں پر یقین رکھنے والے ترقی پسند روس کو نجات دہندہ سمجھا کرتے تھے۔ جب جرمنی نے جاپان اور اٹلی کو ساتھ ملا کر برطانیہ اور روس پر حملہ کیا تو ترقی پسندوں کی ہمدردیاں مظلوموں کے ساتھ ہو گئیں اور وہ ظالموں کا مقابلہ کرنے اور انگریزوں کا ساتھ دینے عملی طور پر میدان میں اتر آئے۔ ایسے ہی لوگوں میں فیض بھی شامل تھے۔

اسی دوران 1941 میں فیض ایک انگریز خاتون ایلس کیتھرن جارج سے نکاح کے دائمی رشتے میں بندھ گئے۔ نکاح شیخ عبداللہ نے پڑھایا اور اس کے بعد مشاعرہ ہوا، جس میں جوش اور مجاز نے بھی شرکت کی۔ انسانی مساوات پر یقین رکھنے والے فیض نے کالج کی ملازمت کو خیرباد کہہ کر فوج میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا اور 1942 میں کیپٹن کی حیثیت سے تقرر پا گئے اور شعبہ تعلقات عامہ سنبھال لیا۔ بہترین کارکردگی کے باعث 1943 میں میجر 1944 میں لیفٹیننٹ کرنل اور 1946 میں MBE یعنی ممبر آف برٹش ایمپائر بنائے گئے۔

جنگ کے خاتمے کے بعد بھی انگریزی فوج سے وابستگی برقرار رہی، جو اُس صورت میں ختم ہوئی کہ جب فیض فوجی زندگی سے اکتا گئے اور واپس تدریس کی طرف آنا چاہا، مگر اب معاشی

معاملات آڑے آئے۔ تاہم اُن ہی دنوں میاں افتخار الدین "پاکستان ٹائمز" کا منصوبہ لے کر فیض کے پاس آئے اور انہیں چیف ایڈیٹر بنانے کی پیشکش کی اور معمولی ردو قدح کے بعد فیض نے ہامی بھرلی۔ 1947 کے آغاز میں اخبار جاری ہوا اور فیض جو اس سے قبل صحافت کے معاملات سے واقف نہیں تھے، اپنی فطری ذہانت سے بخوبی و فراست اس کو چلانے لگے۔ جب اسی اخبار کا اردو ایڈیشن بنام "امروز" سامنے آیا تو اس کی ادارت فیض نے چراغ حسن حسرت کو سونپی۔

پاکستان کے قیام کے بعد فیض پر ایک سخت وقت آیا جب انہیں پنڈی سازش کیس کے تحت پس زندان رکھا گیا۔ گرفتار شدگان میں فوجیوں کے علاوہ غیر فوجی افراد میں سجاد ظہیر، محمد حسین عطا اور فیض شامل تھے۔ پاکستان سیکورٹی ایکٹ کے تحت کی گئی گرفتاری میں احمد ندیم قاسمی بھی شامل تھے۔

دسمبر 1958 میں فیض ایک بار پھر داخلِ زندان کیے گئے۔ 1962 میں فیض کو "لینن امن ایوارڈ" دیا گیا۔ "نقش فریادی" پہلا مجموعہ کلام تھا جو 1941 میں شائع ہوا۔ اس کے بعد "دست صبا" 1952، "زنداں نامہ" 1956، "دست تہ سنگ" 1965، "سر وادیٔ سینا" 1971، "شام شہر یاراں" 1978، "میرے دل میرے مسافر" 1981 اور "کلام فیض" 1982 میں شائع ہوئے۔ نثری مجموعوں میں "میزان" 1962، "صلیبیں میرے دریچے میں" (جیل سے ایلس کو لکھے گئے خطوط)، "متاع لوح و قلم" 1973 "سفر نامہ کیوبا" 1974، "ہماری قومی ثقافت" 1976، "مہ و سال آشنائی" 1980 شامل ہیں۔

20 نومبر 1984 کو ادب کا یہ درخشندہ ستارہ افق کے اس پار کہیں دور جا کر ڈوب گیا۔ ابتدائی وقت سے تادمِ آخر فیض کے اشعار شاعری کا افتخار قرار پائے۔

متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خون دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

بلا سے ہم نے نہ دیکھا، تو اور دیکھیں گے
فروغ گلشن و صوت ہزار کا موسم

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

صبا نے پھر در زنداں پہ آ کے دستک دی
سحر قریب ہے دل سے کہو نہ گھبرائے

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

نجات دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

لاؤ تو قتل نامہ ذرا میں بھی دیکھ لوں
کس کس کی مہر ہے سر محضر لگی ہوئی

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شب غم گزار کے

عاجزی سیکھی، غریبوں کی حمایت سیکھی
یاس و حرمان کے، دکھ درد کے معنی سیکھے

زیردستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا
سرد آہوں کے، رخ زرد کے معنی سیکھے

قدیم رنگِ تغزل کا انوکھا شاعر

استاد قمؔر جلالوی

کب میرا نشیمن اہلِ چمن، گلشن میں گوارا کرتے ہیں
غنچے اپنی آوازوں میں بجلی کو پکارا کرتے ہیں

حبیب ولی محمد کی سوز و گداز سے پُر آواز میں اس غزل کو سن کر آدمی کسی اور ہی دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ یہ صرف حبیب ولی محمد کے فن کا کمال ہے، بلکہ استاد قمر جلالوی کا رنگ بے مثال ہے۔ وہ رنگ، جس کو اس غزل گو نے برصغیر کے کونے کونے میں پہنچا دیا۔ غیاث الدین بلبن کے دور میں جلال الدین خلجی نے ایک چھوٹا سا قصبہ آباد کیا تو اس کا نام جلالی پڑ گیا۔ یو پی (بھارت) کے ضلع علی گڑھ میں واقع اس قدیم علاقے کی نمایاں شناخت ایک جامع مسجد ہے، جس کی تعمیر کو اب سات سو برس ہونے کو آئے۔ جلالی کے لوگ عام طور پر اور وہاں کے سید خاص طور پر صاحب علم، ذی حیثیت اور حکومتی حلقوں کے قریب شمار کئے جاتے تھے۔ سیدوں کی بڑی تعداد زیادہ تر زراعت اور زمینداری سے وابستہ رہی۔ ان تمام باتوں سے بڑھ کر جلالی نے اردو زبان و ادب کی خدمت میں بھی کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ شعراء اور ادباء اپنی ادبی نگارشات سے جلالی کے پیکرِ جمالی کو چار چاند لگاتے رہے۔ سید ظلِ حسین قدؔا کا ایک مرثیہ بہت مشہور ہوا

عندلیب گلِ گلزار رسالت ہوں میں

ان ہی کے صاحبزادے سید افسر علی بقاؔ جلالوی نے بھی بہت نام کمایا۔ ان کا کہا ہوا ایک مرثیہ پورے جلالی میں گونجتا رہا۔

اُفق شام سے اُٹھی جو گھٹا ظلمت کی

اُسی زرخیز جلالی کے گھر میں 1887 میں ایک بچّے نے جنم لیا، جس کا نام محمد حسین تجویز ہوا۔ بچّے کے والد، سید غلام حسین سجاد کا شمار جلالی کے رؤسا میں کیا جاتا تھا۔ آباواجداد کا تعلق سپہ گری سے رہا، اور اسی ضلعے میں انگریز سرکار کی طرف سے زمینداری کا منصب بھی پایا۔ خاندان کے اکثر وبیشتر افراد رسالدار اور رسالدار میجر کے عہدے پر خدمات انجام دیتے رہے۔ کچھ رئیسانہ طور طریقوں اور کچھ اُس زمانے کے رواج کے مطابق محمد حسین کی تمام تر تعلیم وتربیت اقامتی ماحول میں ہوئی، جس میں شعرفہمی وشعرگوئی کی غیر معمولی علامات پائی جاتی تھیں اور اس کا سبب شاید اردگرد کا ماحول اور والد سے منتقل ہونے والا ادبی وشعری ذوق تھا۔

نوعمری سے شعری سفر کا آغاز کرنے والا یہ بچہ جب اپنے عنفوانِ شباب کو پہنچا تو محمد حسین سے قمر جلالوی کا روپ دھار چکا تھا اور ذوقِ شعرگوئی بھی اپنی قیمت وقامت میں ایک قیامت بن چکا تھا۔ عالم یہ تھا کہ نوجوان قمر جلالوی سے اکتسابِ فن کرنے والوں میں پیرانہ سال افراد بھی کوئی جھجک محسوس نہ کرتے تھے۔ اُس زمانے کے ایسے دو قابلِ ذکر شاگرد، عبدالرحمن خان سوزاں اور ریوتی پرشاد دانا تھے، جن کی عمریں بالترتیب 88 اور 92 برس تھیں۔ یوں قمر جلالوی "استاذ" قمر جلالوی کے نام سے مشہور ہونے لگے۔

مرزا داغ دہلوی کے ہم عصر اور لکھنؤ کے مسلّم الثبوت استاد، امیر مینائی جیسے یکتا شاعر کے سامنے استاد قمر جلالوی نے زانوئے ادب تہہ کیا اور جس پر فخر ومباہات کا اظہار ان کے اعلیٰ کردار کا غماز رہا۔

ازل سے معتقد۔ حضرت امیر ہوں میں
اسی لکیر پہ اب تو قمرؔ، فقیر ہوں میں
زرِ قلیل نہیں ہوں کہ دیکھ لے دنیا
جو دفن رہتی ہے وہ دولت۔ کثیر ہوں میں

استاد قمر جلالوی اپنے دلکش اور سحر انگیز طرزِ بیان کے باعث "میر ثانی" بھی کہلائے جانے لگے۔

مریضِ غم پہ اک ایسی شام آتی ہے
کہ چارہ گر کو اُمیدِ سحر نہیں رہتی

اُن کی طرف سے ترکِ ملاقات ہو گئی
ہم جس سے ڈر رہے تھے، وہی بات رہ گئی

دبا کے قبر میں چل بھی دیئے دعا نہ سلام
ذرا سی دیر میں کیا ہو گیا زمانے کو

آج آئے ہوئے ہو تم، کل چلے جاؤ گے، یہ محبت کو اپنی گوارا نہیں
عمر بھر کا سہارا بنو تو بنو، دو گھڑی کا سہارا سہارا نہیں

اب آگے اس میں تمہارا بھی نام آئے گا
جو حکم ہو تو یہیں چھوڑ دوں، فسانے کو

وہ نہ آئیں گے کبھی دیکھ کے کالے بادل
دو گھڑی کے لئے اللہ ہٹا لے بادل

قبل تقسیم ہند، جب مشاعروں کا رواج ایک مستحکم سماج کی دلیل تھا، قمر جلالوی اپنے کلام اور آواز کے خداوندی انعام کے باعث مشاعرے پر چھا جاتے تھے۔ ممتاز نقاد سلیم احمد کا کہنا ہے:

''میرٹھ میں تو میں نے خود دیکھا کہ شہر کا بچہ بچہ استاد کے مخصوص ترنم میں اُن کے شعر پڑھنے لگا اور اس وقت کے نامی گرامی استاد صفی لکھنوی نے اُن کے اشعار کی داد یہ کہہ کر دی کہ آپ نے شعر نہیں سنائے، سینے پر ترشول مارا ہے''۔

یہ تو ہندوستان کا حال تھا اور جب پاکستان آئے تو یہاں بھی مشاعرہ اُن کی شمولیت سے زینت پاتا۔ ممتاز مرثیہ گو ڈاکٹر یاور عباس کا کہنا ہے:

"قمر پیدائشی شاعر تھے۔ اکتسابی جزو کم تھا۔ بڑا بانکا شعر کہتے تھے۔ شعریت ان کے کلام میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ الگ رنگ تھا۔ بہت پرانی شاعری تھی، مگر بڑی مزیدار۔ کراچی کے مشاعروں کی جان تھے"۔

حبیب جالب انہیں "دبستانِ میر تقی میر" کا آخری شاعر قرار دیتے تھے۔ ہندوستان میں خواص و عوام سے اپنے کلام کی اثر آفرینی کا لوہا منوانے والے استاد قمر جلالوی تقسیم ہند کے بعد جب پاکستان چلے آئے اور کراچی میں سکونت اختیار کی تو نئی فضا، نئے حالات اور معاشی معاملات نے استاد کو پریشان کرنا شروع کر دیا۔ طبیعت کی خودداری، کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے سے روکتی اور قدم قدم پر انہیں ٹوکتی رہی، چنانچہ استاد قمر جلالوی نے محنت کو شعار اور کردار بنا کر بلا جھجک معمولی سطح پر اپنے معاشی مسائل کے حل کے لئے تگ و دو شروع کر دی۔ اس معاملے میں وہ اور احسان دانش جفاکشی و سخت کوشی کی ایک قابلِ تقلید مثال قائم کر گئے۔

خوش قسمتی سے استاد قمر جلالوی کو اُس عہد کے نامور ذاکر اور خطیب، علامہ رشید ترابی اور شعبہ نشریات کے بے تاج بادشاہ، زیڈ اے بخاری کی صحبت و قربت میسر آ گئی۔ دونوں حضرات نے نہ صرف یہ کہ اس شاعرِ خوددار و انکسار کی ممکنہ حد تک معاونت کی، بلکہ مشاعروں اور ریڈیائی پروگرام میں استاد قمر جلالوی کے شرکت کو یقینی بنانے میں بھی کاوشیں کیں۔ خود قمر جلالوی بھی ان دنوں نادر روزگار شخصیات کی ہمہ وقت اور ہمیشہ قدر کرتے رہے۔ رفتہ رفتہ کراچی کے مشاعرے، محافل اور مجالس، استاد قمر جلالوی کے نام اور کلام سے رونق پانے لگیں۔ لوگ ان کی شاعری کے رسیا بن گئے۔

درود بھی ہے مناسب، اُسے سلام بھی ہے
کہ جو نبیؐ کا نواسہ بھی ہے، امامؑ بھی ہے

غریب و بے کس و مظلوم و تشنہ کام سلام
علیؑ کے چاند، نبیؐ کے مہ تمام سلام

اُن کے شاعرانہ کمالات وخدمات کا اعتراف عوامی سطح کے ساتھ سرکاری سطح پر بھی کیا جانے لگا۔1959 میں حکومتِ پاکستان نے ان کے لئے ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کیا۔1966 میں اس وقت کے صدر مملکت، ایوب خان نے ایک جلسہ عام میں انہیں نقد انعام سے بھی نوازا۔ استاد قمر جلالوی نے جن اصناف سخن میں شاعری کی، اُن میں غزل، سلام، منقبت، مرثیہ اور رباعیات شامل ہیں۔ کراچی میں اُن کے نمایاں شاگردوں میں اعجاز رحمانی، قضا جلالوی، عطاء اللہ بخار اور علیم محشر چھتاروی شامل ہیں۔ 24 اکتوبر 1968 کو اکیانوے برس کی عمر میں اردو شاعری کا قمر کہلایا جانے والا یہ چاند اُفقِ شعر پر اپنے الفاظ کی چاندنی بکھرا کر اس کی تابناکی کو کچھ اور روشن کر کے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔

کبھی کہا نہ کسی سے ترے فسانے کو
نہ جانے کیسے خبر ہو گئی زمانے کو

ادب اور زندگی کا مجنوںؔ

مجنوںؔ گورکھ پوری کی ادبی خدمات

شاعر، افسانہ نگار، مترجم، مدرّس، نقاد، دانش ور۔ یہ شش جہت اور ہمہ صفت شخصیت جدید اُردو ادب کے معماروں میں سے ایک، مجنوںؔ گورکھ پوری کی ہے۔ اپنے افکار سے کئی نسلوں کی ذہنی تطہیر و تربیت کرنے والے مجنوںؔ ایک دیوانےؔ کے بیٹے تھے۔ یوں دیوانےؔ اور مجنوںؔ نے مل کر خرد افروزی کی ایک ایسی عمارت تعمیر کی، جس میں کسی بھی رُخ سے کوئی خرابی مضمر نہ تھی۔ احمد فاروق، جو مجنوںؔ کے نام سے ادبی دنیا میں چمکے اور دمکے، اُن کے والد محمد فاروق دیوانہ گورکھ پوری، علی گڑھ یونی ورسٹی سے ریاضیات میں ایم ایس سی تھے۔ ذہانت و ذکاوت کا مجموعہ فاروق، ریاضیات کی تدریس کے علاوہ صحافت میں محمد علی جوہرؔ کے ہمدرد میں "تجاہلِ عامیانہ" کے عنوان سے کالم تحریر کرتے تھے، مگر تواتر سے کلام کہنے کے بجائے کم سخنی کو ترجیح دیتے۔

خارِ الم کی دل میں خلش، رات ہی سے تھی
دیکھا جو صبح کو، تو جگر بھی فگار تھا

یوپی اسمبلی میں مسلم لیگ کی نمائندگی بھی کی۔ سو ایسے دیوانےؔ کے یہاں 10 جنوری 1904 کو ایک مجنوںؔ نے جنم لیا۔ ابتدائی تعلیم سے گریجویشن تک گورکھ پور کے تعلیمی مراکز، مرکزِ نگاہ قرار پائے۔ 1934 میں آگرہ یونیورسٹی سے ایم اے، انگریزی اور اُس سے اگلے برس کلکتہ یونیورسٹی سے ایم اے، اُردو کیا۔ دورانِ تعلیم ہی سینٹ اینڈریوز کالج، گورکھ پور میں 1932 سے 1935 تک شعبۂ انگریزی میں درس و تدریس پر مامور ہوئے۔ اُسی سال مجنوںؔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ سے منسلک ہوئے۔ 1936 سے 1937 تک جارج اسلامیا انٹر کالج

، گورکھ پور میں انگریزی اور منطق کے لیکچرر کے طور پر وابستہ ہوئے۔ 1937 سے 1958 تک بطور پروفیسر انگریزی اور صدر شعبۂ اُردو، سینٹ اینڈریوز کالج، گورکھ پور میں خدمات انجام دیتے رہے۔ جب گورکھ پور میں یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا تو مجنوںؔ یونی ورسٹی سے بطور صدر، شعبۂ اُردو وابستہ ہو گئے۔ 1958 سے 1968 تک مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر علی گڑھ تاریخِ ادب اُردو اور ریڈر شعبۂ اُردو میں اپنی عالمانہ اور دانشورانہ صلاحیتوں کے جوہر دکھاتے رہے۔ مئی 1968 میں ترکِ وطن کر کے پاکستان چلے آئے اور جامعہ کراچی سے اعزازی پروفیسر کے طور پر وابستہ ہوئے۔ یہ تو مجنوںؔ کے تعلیمی سفر کا احوال تھا۔ اکتسابی طور پر مجنوںؔ اُردو، انگریزی، عربی، فارسی، ہندی میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ اُنھوں نے ان تمام زبانوں کے ادب کو کھنگالا اور بات سے بات اور نکتے سے نکتہ نکالا۔ اُدھر تخلیقی، تحقیقی اور تنقیدی میدان میں بھی مجنوںؔ شوق کو دیوانگی اور شعور کو فرزانگی سے ہم آمیز کرتے رہے۔ نوعمری ہی میں شعر گوئی کا آغاز ہوا۔ غزلیں اور نظمیں کہیں۔ مشاعروں میں بھی شرکت کی اور یہ سارا ہنگامہ 1930 تک چلتا رہا۔ پھر مجنوںؔ کی طبیعت شعر گوئی سے ہٹ کر کسی دوسرے میدان کو تلاش کرنے لگی۔ تاہم کبھی کبھار شعر کہنے کا سلسلہ جاری رہا۔

وہ کلیاں، اب دلِ صد چاک سے، دلگیر بیٹھی ہیں
جو ہنس کر کہہ رہی تھیں، پھول سے دامن رفو کر لے

یہ گمراہی، یہ خود نا آگہی، اچھی نہیں اے دل
کسی وادی میں کھو جا، اور اپنی جستجو کر لے

ہنوز دم کے اُلجھنے میں، کچھ کمی نہ ہوئی
کوئی نہ کوئی، گریباں میں تار باقی ہے

مجنے تھے پھول جو مرجھا کے رہ گئے سارے
مگر ابھی خلشِ نوکِ خار باقی ہے

جستجو، زندگی کا حاصل ہے
اٹھ گیا جو قدم، وہ منزل ہے

وہ پائی ہے، نگہِ محسن آفریں میں نے
بنا دیا ہے، ہر اک چیز کو حسیں میں نے

مجنوں 21-1920 سے نثر نگاری کی طرف مائل ہوئے۔ یونان کے مشہور فلسفی ہیرا قلطیس پر اُن کا مضمون "نقیب" بدایوں میں "رونے والا فلسفی" کے عنوان سے شائع ہو کر مقبول ہوا۔ اب مجنوں تھے اور ماقبل کی تاریخ اور عصری نثر تھی۔ ٹیگور کی نظموں کے تراجم، یہودیوں کی تاریخ بعنوانِ "صبحِ فلسطین"، خواب اور تعبیرِ خواب، تاریخِ جمالیات اور برگساں، آسکر وائلڈ، ٹالسٹائی، برنارڈ شا، بائرن، شیکسپیئر، ملٹن کے تراجم۔ غرض ایک سے بڑھ کر ایک تحریر سامنے آنے لگی اور اہلِ علم سے داد پانے لگی۔ مشہور جرمن فلاسفر، شوپنہار کے بارے میں مختصر کتاب تحریر کی اور تبصرے کے لئے علامہ اقبال کو بھیجی۔ وہاں سے جواب آیا کہ آج مجھے معلوم ہوا کہ اُردو زبان بھی اس قابل ہے کہ اس میں فلسفے کو ادب بنا کر پیش کیا جا سکے۔ جب گاندھی جی کے قتل کے بعد بھارت میں شورش ہوئی تو وہ تمام لوگ شک کی نظروں سے دیکھے گئے، جو مسلم لیگ سے وابستہ رہ چکے تھے۔ چونکہ مجنوں کے والد مشرقی یو پی میں مسلم لیگ کو مستحکم کرنے میں پیش پیش تھے، لہٰذا جب پولیس تلاشی لینے کے لئے پہنچی تو مجنوں نے وہ بیگ، جس میں مشاہیر کے خطوط تھے، اس خیال سے نذرِ آتش کر دیے کہ وہ کسی اور کے ہاتھ لگ جائیں گے۔ اُن ہی میں علامہ اقبال کا مذکورہ خط بھی شامل تھا۔ 1925 سے مجنوں کی افسانہ نگاری کا آغاز ہوا اور "زیدی کا حشر" اس سلسلے کی پہلی کڑی تھی، جسے نیاز فتح پوری کے بے مثل رسالے "نگار" میں شائع کیا گیا۔ خود مجنوں ابتدا میں نیاز کے طرزِ تحریر سے متاثر رہے، مگر جلد اپنا رنگ الگ اور شناخت جداگانہ بنالی۔ مجنوں کا افسانہ "سمن پوش" جو شاید تیسرا افسانہ تھا، خود مجنوں کو اُس دور میں افسانوی شہرت کا حامل بنا گیا۔ افسانے کی ایسی کہانی کو پڑھ کر بریلی کا ایک نوجوان شفقت اس درجہ متاثر ہوا کہ بار بار پڑھنے لگا

اور کہنے لگا کہ میں یہ افسانہ پڑھتے پڑھتے دنیا سے کوچ کر جاؤں گا اور ایک دن ایسا ہی ہوا، جب افسانہ پڑھتے ہوئے اُسے دل کا دورہ پڑا اور وہ خالقِ حقیقی سے جا ملا۔ نیازؔ نے نگار میں اس کی موت کی خبر شائع کی۔ مجنوںؔ اسے سچ ماننے کو تیار نہ تھے، مگر جب بریلی سے ایک خط موصول ہوا اور انہیں بتایا گیا کہ اگر آپ بریلی آئیں اور قبرستان دیکھیں تو ایک قبر کے کتبے پر "شہیدِ کفن پوش" لکھا دیکھ سکتے ہیں۔ یہ اُسی بدقسمت شفقت کی قبر ہے۔ مجنوںؔ بریلی گئے اور قبرستان بھی پہنچے، مگر قبر تک جانے کی ہمت نہ کر سکے۔ گو خود مجنوںؔ اس افسانے کو اعلیٰ نہیں مانتے تھے۔ مجنوںؔ کے اُس دور کے افسانے پڑھ کر متاثر ہونے والوں میں عصمت چغتائی اور سعادت حسن منٹو جیسے اعلیٰ ذہن رکھنے والے ادیب بھی شامل تھے۔

مجنوںؔ کا اصل میدان تنقید ہے اور اس بات پر عمومی طور پر اتفاق کیا جاتا ہے کہ مجنوںؔ اُردو تنقید کے صفِ اوّل کے نقادوں میں بھی ممتاز ترین ہیں۔ "ادب اور انقلاب" کے مصنف، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، جو خود بھی تنقید نگاری میں اعلیٰ درجہ رکھتے ہیں، مجنوںؔ کے بارے میں کہتے ہیں:

"جدید اُردو ادب کی رہنمائی میں جن نقادوں نے اہم کردار ادا کیا ہے، اُن میں مجنوں صاحب کی حیثیت بہت ممتاز اور نمایاں ہے"۔

مجنوںؔ کی تنقیدی تصانیف میں سے چند حسبِ ذیل ہیں۔ "میرؔ اور اُن کی شاعری"، "غالبؔ: شخص اور شاعر"، "ادب اور زندگی"، "تنقیدی حاشیے"، "نقوش و افکار"، "نکاتِ مجنوںؔ"، "اقبال"۔

4 جون 1988 کو مجنوںؔ کا کراچی میں انتقال ہوا تو اُردو ادب اپنے عہد کے ایک بے مثل و باکمال شخص سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گیا۔

مصطفیٰ زیدی

اُردو کا بانکا شاعر

(اُردو کے نامور شاعر، مصطفیٰ زیدی 10 اکتوبر 1930ء کو الٰہ آباد میں پیدا ہوئے اور 12 اکتوبر 1971ء میں اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ انہوں نے ''تیغ الٰہ آبادی'' سے ''مصطفیٰ زیدی'' بننے تک کا سفر انتہائی خوش اسلوبی کے ساتھ طے کیا۔ انہوں نے بھرپور ادبی زندگی گزاری۔ سرکاری ملازمتوں کے باوجود اپنے اندر کے شاعر کو ہمیشہ زندہ رکھا۔ اُن کی جو کتابیں شائع ہوئیں، اُن کی تفصیل کچھ اس طرح سے ہے۔ ''زنجیریں'' 1947ء، ''روشنی'' 1949ء، ''شہر آذر'' 1958ء، ''موج میری صدف صدف'' 1960ء، ''گریبان'' 1964ء، ''قبائے ساز'' 1967ء، ''کوہِ ندا'' 1971ء (بعد از مرگ)۔ اس مناسبت سے ڈاکٹر قمر عباس کا مضمون پیشِ خدمت ہے۔ ادارہ ''جنگ'')

میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں
تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے

نہ جانے مصطفیٰ زیدی نے یہ شعر کب اور کس خیال اور کمال کے ساتھ کہا کہ یہی شعر جواں مرگ شاعر کی پُر اسرار موت کو ابدی زندگی عطا کر گیا۔ کسے معلوم تھا کہ اُردو شاعری کا ایک درخشندہ ستارہ جو اُفقِ شعر پر اپنی تابانیاں بکھیر کر شاعری کے حُسن کو چار چاند لگا رہا تھا، ایک ایسا شعر کہے گا جو اُس کی زندگی کی تفسیر قرار پائے گا۔ یہی نہیں بلکہ کسی وجدانی کیفیت کے تحت ایک اور شعر میں بھی اُس جواں مرگ نے جواں مرگی کو احساسِ تفاخر کی علامت قرار دیا تھا۔

اب جی حدودِ سُود و زیاں سے گزر گیا
اچھا وہی رہا، جو جوانی میں مر گیا

علم و دانش کی سرزمین جرمنی کے ایک مشہور فلسفی، آرتھر شوپنہار (1788-1860) کا مقولہ ہے: ''جب زندگی کی ہولناکیاں موت کی دہشت پر غالب آجاتی ہیں تو انسان خودکشی پر آمادہ ہو جاتا ہے''۔ مصطفیٰ زیدی کے ذیل میں ایسا ہوا تھا یا نہیں؟ یہ دریافت طلب امر ہے۔ تاہم یہ ضرور تھا کہ وہ زندگی کی مسلسل اذیتوں سے دلبرداشتہ تھے۔ یہ اذیتیں داخلی بھی تھیں اور خارجی بھی۔ غمِ دوراں بھی تھا اور غمِ جاناں بھی۔ گمان کیا جاسکتا ہے کہ حصولِ محبت میں ناکامی، سماج کی طرف سے بیگانگی اور اعلیٰ سرکاری منصب سے برخاستگی (فوجی حکمراں، یحییٰ خان کے دور میں 303 اعلیٰ سرکاری افسران مختلف الزامات کے تحت ملازمت سے برطرف کیے گئے۔ مصطفیٰ زیدی بھی اُن میں سے ایک تھے۔ جب یہ برطرفی عمل میں آئی تو وہ ڈپٹی کمشنر کے طور پر خدمات انجام دے رہے تھے)۔ وہ عوامل تھے جو ایک شاعرِ طرحدار کو ذہنی سطح پر نادار بنا گئے اور بالآخر وہ وقت آیا کہ مصطفیٰ زیدی عین عالمِ جوانی میں زندگانی سے منہ موڑ گئے۔ 12 اکتوبر 1970 کو کراچی کے ایک ہوٹل میں مردہ پائے جانے والے توانا لہجے کے شاعر کی پُر اسرار موت اس لیے بھی ایک زمانے تک اخبارات کی شہ سرخیوں کا موضوع رہی کہ اُن کی زندگی میں داخل ہونے والی خاتون، شہناز، جو مصطفیٰ زیدی کی کئی نظموں اور غزلوں کا موضوع تھی، جائے وقوعہ سے متصل کمرے میں بے ہوش پائی گئی۔ مقدمہ، مدعی، استغاثہ، گواہان، بیانات، غرض کہانی تھی کہ ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ اول شہناز گل کو اس وجہ سے شاملِ تفتیش کیا گیا کہ گمان تھا کہ اس نے مصطفیٰ زیدی کو زہر دیا ہے۔ تاہم، مناسب شہادتیں نہ ملنے کے باعث اُسے بری کر دیا گیا۔ گویا مصطفیٰ زیدی کی موت ''اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا'' کا مصداق بن گئی۔ 1971 میں سامنے آنے والا شعری مجموعہ، ''کوہِ ندا'' جو آخری بھی ثابت ہوا، اُن کی موت کے بعد شائع ہوا۔ اُس کے دیباچے میں شاعر نے تحریر کیا کہ یہ آخری شعری مجموعہ ہے۔ گویا یہ جملہ کسی اٹھائے جانے والے ممکنہ قدم کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ یہ وہ دن تھے (1970) جب ملک

میں پہلی بار قومی انتخابات کا انعقاد ہونے جا رہا تھا اور ملک کے دونوں حصوں (مشرقی پاکستان، موجودہ بنگلہ دیش اور مغربی پاکستان) میں بہت جوش و خروش کا مظاہرہ کیا جا رہا تھا۔ اخبارات مسلسل انتخابی معاملات سے متعلق خبروں کو اجاگر کر رہے تھے۔ ایسے میں مصطفیٰ زیدی کی پُراسرار موت نے اخبارات کی شہ سرخیوں میں اس لئے جگہ پائی کہ ایک صفِ اوّل کا شاعر اور خوبرو سی ایس پی افسر ایک ایسے دردناک انجام سے دوچار ہوا جس کی کسی کو بھی توقع نہ تھی۔ چنانچہ نہ صرف مقامی و ملکی بلکہ بین الاقوامی اخبارات تک نے نہ صرف موت کی خبریں ہی شائع کیں، بلکہ عدالتی کارروائی سے بھی اپنے قارئین کو آگاہ رکھا۔ چالیس برس کی مختصر اور بحرانی زندگی کو اپنے آتشی کلام سے طولانی بنانے والے مصطفیٰ زیدی 10 اکتوبر 1930 کو الٰہ آباد میں پیدا ہوئے۔ والد نے بچے کا نام مصطفیٰ حسین رکھا۔ ابتدائی تعلیم الٰہ آباد کے تعلیمی اداروں میں حاصل کی۔ ماڈرن ہائی اسکول الٰہ آباد سے 1945 میں میٹرک اور ایوننگ کرسچن کالج الٰہ آباد سے انٹرمیڈیٹ کی اسناد حاصل کیں۔ دورانِ تعلیم شعر و سخن کا سلسلہ بھی جاری رہا اور کالج کے "بزمِ اردو" کے سیکریٹری کے طور پر بھی کام کیا، جس سے شعری صلاحیتوں کو مزید جلا ملی۔

کالج کے زمانے کے دوستوں میں ابنِ صفی بہت نمایاں تھے، جو اُن دنوں طغرل فرغام کے قلمی نام سے لکھا کرتے تھے۔ اس پورے عرصے میں مصطفیٰ زیدی "تیغ الٰہ آبادی" کے نام سے مشقِ سخن کرتے رہے۔ یہ وہ دور تھا جب برصغیر میں آزادی کی تحریک اپنے عروج پر تھی۔ سیاست داں، سیاسی کارکن، عوام، دانش ور، ادیب اور شاعر اپنے اپنے انداز میں اس تحریک کو مضبوط سے مضبوط تر کر رہے تھے۔ برصغیر میں جوش کی جذبے کی شدت سے معمور اور حوصلوں سے پُر نظمیں حریت پسندوں کے دلوں میں آزادی کی آگ لگانے اور اُن کو فرنگیوں سے ٹکرانے پر اُکسا رہی تھیں۔ انگریز نے ہندوستان سے کوچ کا ارادہ اور آزادی کا اعلان کر دیا۔ یکایک ہندوستان میں ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے۔ سکھوں نے بھی مسلمانوں کے خلاف کارروائیاں شروع کر دیں۔ نوجوان مصطفیٰ زیدی بھی جوش سے متاثر تھے، لہٰذا وہ اس کیفیت کو برداشت نہ کر سکے اور کڑے تیوروں میں گویا ہوئے۔

میں پوچھتا ہوں، دوبارہ یہ تم سے پوچھتا ہوں
ہمارے تیر، ہماری کمان کیوں چھینی
کسی کے ہاتھ میں دے کر ہزاروں کرپانیں
ہمارے منہ سے ہماری زبان کیوں چھینی

بالآخر ہندوستان کی تقسیم عمل میں آ گئی۔ فسادات، شورش اور ہنگاموں کی فضا تھمی اور زندگی کچھ معمول پر آئی تو تعلیمی سرگرمیاں بھی بحال ہوئیں۔ مصطفیٰ زیدی نے وقت کو رائیگاں نہ جانے دیا اور شعر گوئی کے تیزی سے پروان چڑھتے شوق کے ساتھ تعلیمی مدارج طے کرنے کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ 1950 میں الہ آباد یونی ورسٹی سے بی اے کیا اور چھٹی پوزیشن حاصل کی۔ اسی سال مصطفیٰ زیدی نے آبائی وطن کو خیر باد کہا اور پاکستان چلے آئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے انگریزی کرنے کے بعد اسلامیہ کالج کراچی اور پشاور یونی ورسٹی میں انگریزی پڑھانے پر مامور ہوئے۔ 1954 میں سول سروس کا امتحان پاس کرنے کے بعد تربیت کے لئے برطانیہ بھیجے گئے اور تکمیل پر وطن واپسی کے بعد مختلف اعلیٰ سرکاری عہدوں پر تعینات ہوئے۔ نوابشاہ، ساہیوال، جہلم، خانیوال اور لاہور وغیرہ وہ مقامات تھے جہاں بطور ڈپٹی کمشنر کام کیا۔ جس وقت ملازمت سے برطرفی کے احکامات آئے وہ اعلیٰ سرکاری عہدے پر کام کر رہے تھے۔ سول سروس میں آنے کے بعد شاعر مصطفیٰ زیدی اور ایک سول سرونٹ مصطفیٰ زیدی میں کشمکش کا آغاز ہوا۔ اگرچہ دونوں نے ابتدائی طور پر بھرپور ترقی کی، مگر شاعری کی طبع آزاد ایک پابند طرزِ حیات کو احساسات اور جمالیات کی شکست کا باعث سمجھنے لگی۔

مصطفیٰ زیدی نے سول سروس میں رہتے ہوئے زندگی کو عمدہ طریقے سے برتا۔ خوش حالی کا دور دیکھا، غیر ممالک کے دورے کئے، جرمن خاتون سے شادی کی، جن سے دو بچے ہوئے۔ یوں ایک سول سرونٹ کے طور پر زندگی مکمل رہی۔ مگر خانگی زندگی ایک شاعر کے اندر کی دیوانگی کو کسی پل چین سے بیٹھنے نہیں دے رہی تھی۔ جوش اور فراق جیسے سخنور اور سخن فہم حضرات سے اپنے کام اور

کلام کی داد پانے والے مگر کچھ ناقدین کی طرف سے نظر انداز کیے جانے والے دلبر و دلبرداشتہ شاعر کی زندگی پر ایک امریکی خاتون لاریل اسٹیلیے نے شکاگو یونی ورسٹی سے 2005 میں پی ایچ ڈی کا مقالہ تحریر کیا۔ اسٹیلیے فیض کی مداح ہیں اور اُن پر لکھا بھی ہے۔ مصطفیٰ زیدی پر لکھے گئے ایک مضمون میں خاتون نے یہ جملہ بھی تحریر کیا:

''پاکستان وہ ملک ہے جہاں شاعروں کا کام کئی جہتوں سے سیاست دانوں سے زیادہ وقعت رکھتا ہے۔''

یہی اسٹیلیے تحریر کرتی ہے کہ پاکستان میں فیض کے بعد سامنے آنے والے شعراء میں ناصر کاظمی اور مصطفیٰ زیدی بہت نمایاں تھے۔ مصطفیٰ زیدی کے اشعار ایک شاعر کے دل سے نکل کر محفل میں جا پہنچے اور مختلف زاویوں سے گفتگو کا موضوع بنے۔

ان ہی پتھروں پہ چل کر، اگر آ سکو تو آؤ
مرے گھر کے راستے میں، کوئی کہکشاں نہیں ہے
مرے دل کی کیفیت کو، مرے آنسوؤں سے پوچھو
مرا مجلسی تبسّم، مرا ترجماں نہیں ہے

اے مجھے چھوڑ کے طوفان میں جانے والی
دوست ہوتا ہے تلاطم میں سفینے کی طرح

ہائے اب بھول گیا رنگِ حنا بھی تیرا
خط کبھی خون سے تحریر ہوا کرتے تھے

☆☆☆☆☆

میر انیسؔ: تہذیبِ سخن کا معجز نما شاعر

اگر شاعری سماج پر اور افراد پر مثبت اثرات مرتب کرتی ہے، تو ستائش کے قابل ہے۔ اگر شاعری سے جذبہ، ایثار و قربانی بیدار ہوتا ہے، تو اسے اپنانا چاہیے۔ اگر شاعری سے زبان و بیان دُرست ہوتی ہے، تو اسے ضرور پڑھنا چاہیے۔ اگر شاعری سے رشتے ناتوں، ادب و آداب اور حفظِ مراتب سے واقفیت ہوتی ہے، تو اسے توجہ سے سمجھنا چاہیے۔ اگر شاعری سے اخلاقی مفاسد دُور ہوتے ہیں، تو اسے اپنے سے قریب کرنا چاہیے اور اگر شاعری سے کوئی سبق حاصل ہوتا ہے، تو اسے کارآمد جاننا چاہیے۔ اگر یہ تمام خوبیاں کسی ایک شاعر میں جمع ہو جائیں تو وہ بلا مبالغہ "عظیم شاعر" کی صف میں جگہ پائے گا۔ بیان کی گئی صفات میں سے ہر بڑے شاعر کے پاس کوئی نہ کوئی صفت ضرور موجود رہی، جس کے باعث وہ "بڑا شاعر" کہلایا، تاہم "عظیم شاعر" کی صف میں جو نام سب سے جلی اور چمن شاعری میں مانندِ کلی نظر آتا ہے، وہ میر انیسؔ ہے۔ وہ انیسؔ جس کو اُردو سے اُنس رہا اور جس کے سبب وہ اُردو شاعری کا مونس قرار پایا۔ یوں طبیعت کی مناسبت سے موانست تک کا یہ سفر خاندانِ انیسؔ کا طرۂ امتیاز اور اعزاز ٹھہرا۔ پشتوں سے خانوادہ انیسؔ اُلفتِ اُردو میں گرفتار اور اس کے لیے اٹھائی جانے والی صعوبتوں سے سرشار رہا۔ ویسے تو میر انیسؔ کے پردادا، میر ضاحکؔ سے پیشتر بھی چلن اُردو سے ملن ہی کا تھا، مگر میر ضاحکؔ نے کوچۂ شعر کو اپنے نام اور کلام سے اعتبار عطا کیا۔ اُن کی اور مرزا رفیع سوداؔ کی معاصرانہ چشمکوں نے ہجو گوئی کی ایک نئی دنیا آباد کی، ایک تاریخ مرتب کی، ایسی تاریخ جو آج بھی تنسیخ سے کوسوں دُور ہے۔ اُن کا دیوان رباعیات، سلام، نوحوں، مرثیوں، ہزلوں اور غزلوں سے پُر ہے۔ انیسؔ کے دادا میر حسنؔ اشعار کہنے میں حُسن اور سحر کی آمیزش سے کام لیتے۔ مثنوی "سحر البیان" آج بھی سخن کا معجزہ قرار دی جاتی ہے اور جس کا یہ شعر زباں زدِ خاص و عام ہے۔

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سِن
جوانی کی راتیں مرادوں کے دن

انیس کے والد میر مستحسن خلیق طرزِ سخن میں ممتاز اور معاصر شعراء میں منفرد آواز کے مالک تھے۔ مصحفی سے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔ جب ایک محفل میں عجب تیوروں سے غزل کا مطلع پڑھا تو کہنہ مشق شاعر خواجہ حیدر علی آتش نے اپنی غزل پھاڑ کر پھینک دی۔

رشکِ آئینہ ہے اس رشکِ قمر کا پہلو
صاف ادھر سے نظر آتا ہے اُدھر کا پہلو

ابتدائی منازل کے بعد خلیق کے قرطاس وقلم سے مرثیہ نگاری کا چشمہ جاری ہو گیا اور پھر بات اُس سخنور تک آگئی کہ جسے دنیا میر ببر علی انیس کے نام سے جانتی ہے۔ یوں انیس کے جدامجد میر امامی سے شروع ہونے والا سلسلہ، شعروسخن میر ہدایت اللہ، میر عزیز اللہ، میر ضاحک، میر حسن، میر خلیق تک سفر کرتے کرتے جب میر انیس تک پہنچا تو گویا قوتِ گویائی معجزنمائی کیفیت کی حامل ہو چکی تھی۔ اسی کیفیتِ سرشار اور خمار میں حقیقتِ اظہار لبوں تک آیا۔

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

ادیب، دانشور، محقق، نقاد، تاریخ دان اور ساٹھ سے زائد کتب کے مصنف، پروفیسر محی الدین قادری زور نے ''تنقیدی مقالات'' میں دنیا کی بڑی شاعری جس کی زبان اور خیالات نے اپنے ملک وقوم کی ذہنیت اور اخلاق وعادات کی اصلاح کی، حسبِ ذیل قرار دیں۔ قدیم یونانی رزمیہ ''ایلیڈ''، لاطینی رزمیہ نظم ''اینیڈ''، مہابھارت، رامائن، پیراڈائز لاسٹ، شیکسپیئر کے بعض ڈرامے، شاہنامہ۔ لیکن مذکورہ تمام شہکاروں اور شہپاروں پر انہوں نے ظاہری اور معنوی حیثیتوں سے کلامِ انیس کو برتر قرار دیا۔ جدید تنقید کے بنیادی افراد میں پروفیسر آلِ احمد سرور کو ممتاز

مقام حاصل ہے۔ اُردو ادب سے رغبت رکھنے والے سرورؔ، اپنے مضمون " روایت اور تجربے اُردو شاعری میں " انیسؔ کی بابت یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں: " انیسؔ الفاظ کے جوہری ہیں۔ انہوں نے کربلا کے واقعات کو ہندوستانی لباس عطا کر کے فن کا خون نہیں کیا، اسے زندگی عطا کی۔ اُن کی زبان اور اُن کی ترصیع دونوں کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔"

اودھ کا دارالحکومت فیض آباد وہ تاریخی مقام تھا، جہاں میر انیسؔ پیدا ہوئے۔ اُن کے بزرگ دلّی کے لٹنے کے بعد فیض آباد چلے آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے کئی نسلیں اسی جگہ گزار دیں۔ میر خلیقؔ کے گھر بچہ پیدا ہوا اور انیس نام تجویز ہوا۔ خلیقؔ اُس وقت تک مرثیہ گوئی میں نام کما چکے تھے۔ باپ نے دل میں ٹھانی کہ بچے کی تربیت میں کوئی کوتاہی نہیں کریں گے اور اسی ڈھب پر تربیت شروع ہوئی۔ انیسؔ کی والدہ تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ عربی اور فارسی میں دستگاہ حاصل تھی اور انیسؔ کی ابتدائی تعلیم و تربیت اُن ہی کے زیرِ سایہ ہوئی۔

اگلی منزل درسیات کی تھی، جس میں حکیم میر کلو سے اسباق حاصل کیے۔ اُس سے اگلی منزل کے طور پر شیعہ اور سُنی عالم نجف علی اور مولوی حیدر علی کو تعلیم و تربیت کی ذمے داری تفویض ہوئی۔ یہ تو مکتبی اور درسی تعلیم کا احوال تھا۔ اُدھر شعری تربیت کے لیے ناسخؔ کی خدمت میں بھیجا گیا۔ اب شعر و سخن کا دور شروع ہوا اور غزل پہ غزل کہی جانے لگی۔ ایک دن باپ کی موجودگی میں ناسخؔ کو غزل سنائی اور جب یہ شعر پڑھا

کھلا باعث یہ اس بے درد کے آنسو نکلنے کا
دھواں لگتا ہے آنکھوں میں کسی کے دل کے جلنے کا

تو کہنہ مشق استاد بھی بے ساختہ داد دینے پر مجبور ہو گیا اور پیش گوئی کی کہ بچہ نہ صرف خاندان کی لاج رکھے گا، بلکہ شہرت عالمی قرار پائے گی۔

ناسخؔ ویسے بھی بہت سی چیزوں کو منسوخ کرنے میں طاق تھے۔ انہوں نے شاگرد کا تخلص جو حزیںؔ تھا، بدل کر انیسؔ کر دیا۔ تاہم شاگرد کی طبیعت کی نجابت، طہارت اور متانت کسی اور جادہ

فکر کی تلاش میں سرگرداں تھی۔ ایک دن نئی غزل کہہ کر باپ کو سنائی تو تہذیبی فضا میں رچا بسا باپ بیٹے کو صلاح دینے لگا کہ اب غزل کو پسر سلام کرو۔ بیٹے کو باپ کا فقرہ ایک مصرعہ معلوم ہوا اور مصرعہ بھی صنفِ سلام کا۔ بس اُس کے بعد متین فکر اور پاکیزہ سوچ رکھنے والے انیسؔ نے مرثیہ نگاری کا علم ہاتھ میں تھام لیا۔

انیسؔ کی چال ڈھال، انداز نشست و برخاست، لب ولہجہ، قد وقامت مرثیہ گوئی کے لیے فطری مناسبت رکھتا تھا۔ گویا انیسؔ مرثیے کے لیے اور مرثیہ انیسؔ کے لیے وجود میں آیا تھا۔ مرثیہ بھی انیسؔ کو پا کر ایسا مسرور ہوا کہ گویا کسی ایسے ہی باکمال کا منتظر تھا جو اُسے اوجِ ثریا تک پہنچائے اور صنفِ سخن کو امرؔ بنائے۔

اب انیسؔ پے در پے مرثیہ کہنے لگے اور نہ صرف کہنے لگے بلکہ مرثیہ پڑھنے کا بھی ایک نیا رنگ اختیار کر لیا۔ انیسؔ کی مرثیے کی خوانندگی اُس معراج پر پہنچی کہ لوگ انیسؔ کو پڑھنے کے ساتھ سننے کے بھی شائق ہو گئے۔ مرثیے کی خوانندگی باقاعدہ ایک فن کی صورت اختیار کر گئی اور اس کو اگلے وقتوں اور لوگوں نے خوب برتا۔ زیڈ اے بخاری کا شمار بھی ایسے ہی افراد میں ہوا کرتا تھا، جنھوں نے پاکستان میں ابتدائی وقت میں نشریاتی ادارے سے تحت اللفظ خوانی کو فروغ دیا۔

دارالحکومت فیض آباد سے جب لکھنوء منتقل ہوا تو انیسؔ کو بھی اُس شہرِ بے نظیر میں جانے کا موقع مل گیا۔ وہاں دبیرؔ لوگوں کو اپنی شاعری کا اسیر کر چکے تھے۔ تاہم جب انیسؔ تواتر سے کلام سنانے لگے تو لوگ جوق در جوق انہیں سننے کے لیے شہر کے چہار اطراف سے آنے لگے۔ آلاتِ حرب وضرب سے واقف، فنِ سپہ گری کے شناسا، گھڑ سواری میں طاق، علم الالوان کے رسیا، حیوانات خصوصاً شیر کی عادات وخصائل کو کماحقہ جاننے والے انیسؔ نے ان تمام علوم کو اپنے مرثیوں میں کمال خوبی سے نظم کیا۔

جب انگریزوں نے لکھنوء کی خوشحالی پر نظرِ بد کی تو یہ ہنستا بستا دانش کدہ اور علوم وفنون کا گلدستہ اجڑ کر رہ گیا۔ انیسؔ بھی گردشِ لیل ونہار کے حصار میں آئے اور لکھنوء سے باہر نکلنا پڑا۔ عظیم آباد، الہ آباد، کانپور، بنارس، دکن غرض ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے رہے، مگر لکھنوء کی

یاد برابر ستاتی رہی۔ غریب الوطنی کے بھیانک تجربے نے کلام کو اور بھی دو آتشہ بنا دیا۔

غربت میں کوئی چاہنے والا نہیں ہوتا
شمعیں بھی جلاؤ تو اجالا نہیں ہوتا

الفاظ کا چناؤ، محاوروں کا استعمال، روز مرّہ کا شعور، صنعتوں کا برتنا، زبان کی سادگی و سلاست، کلام کی فصاحت و بلاغت، مناظرِ فطرت، مشاہدہ، قدرت غرض شاعری کی تمام تر خوبیاں کامل ترین سطح پر انیسؔ کے یہاں نظر آتی ہیں۔

انیسؔ دم کا بھروسا نہیں ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

خیالِ خاطرِ احباب چاہیے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

کسی کو کیا ہو دلوں کی شکستگی کی خبر
کہ ٹوٹنے میں یہ شیشے صدا نہیں رکھتے

اُن کے کلام کی نجابت سیرت کی طہارت کی گواہی دیتی ہے۔ حمدیہ، نعتیہ اور رثائیہ کلام قدرت کا انعام نظر آتا ہے۔

10 دسمبر 1874 کو اردو شاعری کا یہ تاجدار دنیائے شاعری کے سرمائے میں کثیر اضافہ کر کے دنیا سے سدھارا۔ اُس دنیا سے جس کے ہر جلوے میں اُسے خدائے لم یزال نظر آتا رہا۔

گلشن میں پھروں کہ سیرِ صحرا دیکھوں
یا معدن و کوہ و دشت و دریا دیکھوں

ہر جا تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے
حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

میر خلیل الرحمان: صحافتی خدمات

"محنت ایک نہ ایک دن ضرور رنگ لاتی ہے"۔ اسے قول قرار دیا جائے، محاورہ قرار دیا جائے یا ضرب المثل۔ تینوں کا اطلاق کسی اور پر ہو نہ ہو، جس شخص کے لیے حرف بہ حرف صادق آتا ہے، اُس کا نام میر خلیل الرحمان ہے۔ گوجرانوالہ، پنجاب میں ایک متوسط گھرانے میں 1927 میں ایک بچے نے جنم لیا۔ مکان مکینوں کی دیانت اور محنت کی کہانی سناتا نظر آتا تھا۔ بچے کی زندگی کا ابتدائی زمانہ تعلیم و تربیت سے عبارت رہا۔ آباؤاجداد کا تعلق کشمیر سے تھا۔ تاہم ذریعہ معاش کی تلاش کشمیر سے پنجاب لے آئی۔ یہاں کچھ وقت گزارا ہی تھا کہ ماں باپ ایک بار پھر ہجرت کی صعوبت کا سامنا کرنے پر مجبور ہوئے۔ اس بار سفر ہندوستان کے دارالحکومت دہلی کا تھا۔ وہ شہر دہلی جو بسنے اور اجڑنے کی کئی کہانیوں کا مرکزی کردار تھا۔ وہ شہر دہلی جو ہندوستان کی تاریخ کا مرکزی دھارا اور علم و ادب کا گہوارہ تھا۔ وہ شہر دہلی جو نامور شعراء اور ادیبوں کا مسکن اور مدفن تھا۔

بچے کی تعلیم کا ساتواں درجہ تھا کہ ماں جیسی انمول ہستی سے محرومی کا داغ دیکھنا پڑا۔ فتح پوری ہائی اسکول، دہلی سے میٹرک کیا تو گویا زندگی میں فتوحات حاصل کرنے کی طرف قدم بڑھا دیا۔ تاہم اسی منزل پر باپ نے بھی ہمیشہ کے لیے منہ موڑ لیا۔

زندگی استقلال اور پامردی کا امتحان لینے پر تُل گئی۔ کم عمر میر خلیل الرحمان نے بھی ہر امتحان دینے کا فیصلہ کر لیا۔ دریا گنج کمرشل کالج، دہلی سے بی کام گریجویٹ کی سند ایک طرح سے کاروباری زندگی میں کامیابی کی مستند علامت تھی۔ برصغیر کے سیاسی حالات انتشار اور خلفشار کا شکار ہو چلے۔ بچہ چونکہ کم عمری ہی سے شعور کی منازل طے کرنے لگا تھا، لہٰذا جب آزادی کی تحریک تیز تر ہوئی تو پاکستان کی تحریک دل میں چھپے ارمان کی تحریک بن گئی اور شعور سے گزر کر لاشعور کا حصہ بن گئی۔ دہلی کی سیاست کا ہر گزرتا لمحہ آزادی کی کہانی سناتا اور کسی منزل کا پتا بتاتا۔ کامرس کی تعلیم

مکمل کرنے کے دوران ہی دل نے فیصلہ کیا کہ کوئی منفرد کام کیا جائے۔ دل میں موجود صحافت کی حرارت آگ کی حدت میں تبدیل ہو گئی۔ چونکہ کامرس کی تعلیم حاصل کی تھی، اس لیے تعلیم مکمل کرتے ہی اسٹینو گرافر کی ملازمت کا موقع مل گیا۔ ادارہ کاروباری تھا اور میر خلیل الرحمان کو مالک کے لیے کاروباری خطوط تحریر کرنے ہوتے تھے، یوں کاروباری خط و کتابت ضرورت سے زیادہ عادت بن گئی۔

قدرت نے جلد ہی ایک ایسے شخص سے رابطہ کرا دیا، جو صحافت سے وابستہ تھا۔ میر خلیل الرحمان کو گویا گوہر مقصود حاصل ہوتا نظر آنے لگا۔ دادا عشرت علی "نگار خانہ" کے نام سے قلمی پرچہ نکالا کرتے تھے، جسے بعد میں شام کا روزنامہ بنا دیا اور "مسلمان" نام رکھا گیا۔ میر خلیل الرحمان نے دادا عشرت علی کے دفتر کو وقت دینا شروع کر دیا۔ عشرت علی اُس نوجوان کی علمی صلاحیت کے یوں قائل ہوتے چلے گئے کہ وہ اشتہاری اداروں کو انگریزی میں خطوط بھیجنے میں بہت طاق تھا۔ تاہم یہ اُس بے قرار اور متجسس طبیعت کا شکار نوجوان کی منزل نہیں تھی، ہاں منزل تک پہنچنے کا راستہ ضرور تھا۔

عشرت علی پرچہ اُس نوجوان کو سونپ گئے۔ اب وہ نوجوان صحافت کو عبادت کی طرح انجام دینے لگا۔ والدین کی تربیت نے شرافت اور متانت کو طبیعت کا جزو لازم بنا دیا تھا۔ پانچ چھوٹے بہن بھائیوں کی ذمے داری اور مقصد کی طلبگاری نوجوان کو صبح و شام صرف اور صرف کام پر آمادہ رکھتی۔ صبح صادق دفتر آ کر اُس کی صفائی ستھرائی کے بعد انگریزی اخبارات سے اہم خبروں کو اُردو میں ڈھالنے اور اُس سے نیا نکتہ نکالنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ ساتھ میں ریڈیو سے خبریں سن کر شام کے اخبار کے لیے متن کی تیاری تدبر، فراست اور ہوشیاری سے کی جاتی۔

دلی کا چاوڑی بازار وہ مقام تھا جہاں دفتر کا پریس تھا۔ وہیں وہ نوجوان جو اخبار کا مالک بھی تھا، شام کو اخبار بانٹتا بھی نظر آتا۔ اخبار فروشوں سے رقم ملتی تو اخبار ہی کے لیے مزید کاغذ خریدا جاتا۔ پتھر کا پریس ایک گھنٹے میں پانچ سو سے سات سو اخبار چھاپتا۔ ایک جذبہ تھا، ایک احساس تھا کہ قائداعظم کی معاونت کی جائے۔

وقت کچھ آگے بڑھا تو ہندوستان کی آزادی ایک واضح شکل اختیار کرتی نظر آنے لگی۔ اب اخبار کا کوئی اور مناسب نام سوچا جانے لگا۔ دوسری عالمی جنگ عروج پر تھی۔ اوّل اوّل خیال آیا کہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ انگریز سے آزادی کی جدوجہد ہی تو ہے، چنانچہ اخبار کا نام "جدوجہد" بہتر رہے گا۔ تاہم اس نام کو یوں رد کیا گیا کہ جدوجہد کی ادائیگی زبان کو لکنت کی زحمت میں مبتلا کرتی تھی۔ نوجوان کے ذہن و دل میں آزادی کی امنگ اور مزاج میں ترنگ نے اُس پورے پس منظر کو "جنگ" کی حیثیت دے دی اور پھر "روزنامہ جنگ" منظرنامے کا حصہ اور صحافتی زندگی کا مستقل قصہ بن کر رہ گیا۔

اگرچہ اس نوجوان کو صحافت کا کوئی سابقہ تجربہ نہ تھا، مگر خلوصِ نیت اور جذبے کی قوت نے کام کو آسان بنا دیا۔ اب اخبار تھا اور پاکستان اور قائداعظم کے بارے میں مسلسل اور مستقل گفتگو تھی۔ اب آزادی کی تحریک نہ رکنے کے لیے چل پڑی تھی۔ قریہ قریہ کوچہ کوچہ پاکستان کا نعرہ تھا۔

انگریز سرکار نے ہندوستان پر اپنی گرفت کچھ اور مضبوط کرنے کے لیے "ڈیفنس آف انڈیا رولز" نافذ کر دیا، جس کے تحت کوئی بھی ایسی تحریر یا تقریر جس میں برطانوی حکومت کے خلاف اُکسایا گیا ہو، ایکٹ کی خلاف ورزی کے زمرے میں شمار کی جاتی اور خلاف ورزی کرنے والے کو سخت تادیبی کارروائی کا سامنا کرنا پڑتا۔ نوجوان میر خلیل الرحمان نے آزادی کے لہجہ و سرشاری اور طبیعت کی بے قراری کے تحت اخبار میں یہ تحریر کر دیا کہ جب تک انگریز پاکستان کی حمایت نہ کریں، مسلمانوں کو انگریز فوج کا حصہ بننے سے گریز کرنا چاہیے۔ فوری طور پر "ڈیفنس آف انڈیا رولز" کا قانون حرکت میں آیا اور نوجوان صحافی کو جیل بھیج دیا گیا۔

دہلی کا "حوض قاضی" تھانہ وہ جگہ تھی جہاں ایک رات کے لیے رکھا گیا، اُس کے بعد سنٹرل جیل بھیج دیا گیا۔ 23 دن کے بعد پریس ایڈوائزری کمیٹی کے سامنے پیش کیا گیا۔ "اسٹیٹس مین" کے دفتر میں ایک انگریز ڈپٹی کمشنر اور دو ہندو ایڈیٹر کیس کی سماعت کے لیے موجود تھے۔ کوئی مسلمان نمائندہ ایڈوائزری کمیٹی کا رکن نہیں تھا۔ سخت ردّ و قدح کے بعد میر خلیل الرحمان کو متنبہ کرنے کے بعد چھوڑ دیا گیا۔

اگلی مرتبہ اخبار کی سرخی "سسلی میں انگریزوں کا بیڑہ غرق ہو گیا" تادیبی کارروائی کا موجب قرار پائی، جس کے نتیجے میں ایک بار پھر حوالات اور ایڈوائزری کمیٹی کا سامنا کرنا پڑا۔ تاہم یہ دشواریاں اور پریشانیاں بجائے ہمت پست کرنے کے ہمت بڑھانے اور کچھ کر دکھانے کی طرف متوجہ کرتی رہیں۔

20 فروری 1944 کا دن اور سال میر خلیل الرحمان کے لیے کامیابی کی ایک مثال بن گیا۔ عقدِ مناکحت زندگی کے لیے مسلسل راحت کا پیغام لایا۔ اب مزید تن دہی اور لگن زیست کا چلن بن گئی۔ قائداعظم سے ہونے والی ہر ملاقات ایک سوغات معلوم ہونے لگی۔

بالآخر تقسیم ہند کا دن آ پہنچا۔ قائداعظم نے اعلان کر دیا کہ کراچی پاکستان کا دارالحکومت ہوگا۔ جونہی پاکستان بننے کا اعلان ہوا، میر تقی میر کی دہلی ایک بار پھر اجڑی۔ بود و باش سے مسرت خارج ہوئی اور وحشت نے ڈیرے ڈال لیے۔ قتل و غارت، خون خرابہ، جلاؤ گھیراؤ، غرض انسانیت قعرِ مذلت میں ڈوبتی دکھائی دینے لگی۔ فسادات نے میر خلیل الرحمان کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔

پہلے ارادہ تھا کہ دہلی اور کراچی سے بیک وقت اخبار جاری کیا جائے، تاہم ایسا نہ ہو سکا۔ "روزنامہ جنگ دہلی" سے تقسیم ہند کے فوری بعد ضمانتیں طلب کی جانے لگیں۔ اداریے، مضامین اور مدیر کے نام خطوط تک قطع و برید کی زد میں آنے لگے۔ دہلی میں اخبار فروشوں کو ہراساں کیا جانے لگا کہ مسلمانوں کے اخبارات کی ترسیل نہ کی جائے۔ یہ سب کچھ دہلی میں اخبار کو چلانے اور لوگوں تک پہنچانے میں رکاوٹوں کا موجب بننے لگا۔

میر خلیل الرحمان 14 اگست 1947 کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ڈیکوٹہ طیارے میں بحیثیت صحافی کراچی پہنچے۔ انتقالِ اقتدار کی پُر وقار تقریب دیکھی، جو گورنر جنرل ہاؤس میں منعقد ہوئی۔ ملی جذبے سے معمور اور نئے تشخص سے مسرور میر خلیل الرحمان تقریب کے بعد سندھ اسمبلی کی عمارت پر پہنچے جہاں سے قائداعظم کی بگھی والی سواری کو گزرنا تھا۔ وہ یہ منظر دیکھ کر خود پر قابو نہ پا سکے اور بے اختیار نکلنے والے اشک رواں دامن اور آستینوں کو تر کرتے رہے۔

اب کراچی سے اخبار کے اجراء کی کوششوں کا آغاز ہوا، جونئی مملکت میں جوئے شیر لانے

کے مترادف تھا۔ بالآخر ایک طویل کار دشوار اور مسلسل عزمِ پیکار کے بعد 15 اکتوبر 1947 کو" روزنامہ جنگ کراچی" منصۂ شہود پر آیا۔

میر خلیل الرحمان نے تہیہ کرلیا کہ اخبار کو اُس سطح پر لے جائیں گے کہ جہاں اخبار اور اعتبار ہم وزن قرار پائیں گے۔ پہلے سے موجود اخباروں کی موجودگی میں کسی نئے اخبار کا جگہ بنانا اور اور اُسے عوامی سطح پر منوانا آسان کام نہیں تھا۔ تاہم میر خلیل الرحمان کی طبیعت میں جستجو کا عنصر اور ہر پل کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کی لگن کسی خوش گوار امرِ ممکنہ کی طرف اشارہ کرتی نظر آتی تھی۔ وہ صرف اخبار کے مالک ہی نہیں تھے، بلکہ اخبار کے لیے خبروں کی فراہمی میں خود بھی تگ و دو کرتے تھے۔ کبھی وہ اُس کے لیے رپورٹنگ کرتے، کبھی اداریے تحریر کرتے، کبھی بیرونِ ملک دورے کے دوران یا وہاں سے وطن واپسی پر ہونے والے تجربات سے قارئین کو مضمون یا سفرنامے کی صورت میں آگاہ کرتے۔ یہی نہیں وہ اس بات کا بھی خیال رکھتے کہ شہ سرخی کیا ہونی چاہیے، کون سی خبر صفحہ اوّل اور کون سی صفحہ آخر کی زینت بنے گی۔

انھوں نے رفتہ رفتہ ایک متحرک اور فعال ادارتی عملہ حاصل کیا۔ اخبار کو ہر عمر کے قاری کی پسند بنانے کے لیے مذہب، سیاست، ادب، معیشت، فلسفہ، سائنس، کھیل، طالب علم، اطفال اور دیگر گوشہ حیات سے تعلق رکھنے والی خبروں کو سلیقے اور اہتمام سے پیش کیا۔

ادب سے براہِ راست تعلق نہ رکھنے کے باوجود میر خلیل الرحمان نے ابتدا ہی سے علم و ادب سے وابستہ نابغہ، روزگار افراد کی نگارشات سے اخبار کو زینت دی۔ رئیس امروہوی، سید محمد تقی، مجید لاہوری، شفیع عقیل، شوکت تھانوی، ابراہیم جلیس، جوش ملیح آبادی، نیاز فتح پوری، حفیظ جالندھری، فیض احمد فیض، ابنِ انشاء، احمد ندیم قاسمی، جمیل الدین عالی اور دیگر اصحابِ علم و دانش مختلف اوقات میں اخبار سے جُڑے رہے اور اپنی تحریروں سے علم و دانش کے موتی پروتے اور سمندر کو کوزے میں سموتے رہے۔ میر خلیل الرحمان نے یہ التزام بھی برتا کہ جب بھی کوئی نامور شخصیت اخبار سے وابستہ ہوئی تو اُس کی خبر صفحہ اوّل پر تصویر کے ساتھ بطور اعلان شائع کی۔ اس سلسلے کا آغاز نامور مزاح نگار، مجید لاہوری کی وابستگی سے کیا گیا تھا۔ ان تمام مدیرانہ اور مدبرانہ صلاحیتوں

کی بنیاد پر اخبار نے لوگوں کے دلوں میں گھر کرنا شروع کیا۔ پھر تو یہ نوبت آئی کہ ملک میں رونما ہونے والا کوئی واقعہ، حادثہ، سانحہ، خبر ایسی نہ تھی جسے اخبار نے اپنے قاری تک نہ پہنچایا ہو۔ دیکھتے ہی دیکھتے اخبار پہلے عوام کی ضرورت اور پھر عادت بن گیا۔

ادارتی عملے کی ذہانت اور انتظامی عملے کی ہمہ وقت محنت اور ان دونوں سے بالا اور سب سے اعلیٰ میر خلیل الرحمان کی منتظمانہ اور مدبرانہ لیاقت اخبار کی روز افزوں مقبولیت اور کامیابی کی ضمانت بن گئی۔ حکومتی حلقے، حزبِ مخالف کے رہنما، مذہبی جماعتوں کے رہبران، سماجی کارکنان، قومی رضا کار، طالب علم، خواتین، کاروباری حضرات، فنونِ لطیفہ سے تعلق رکھنے والے افراد، غرض معاشرے کا ہر طبقہ اخبار کو ذوق وشوق سے پڑھنے لگا اور اخبار کی تعدادِ اشاعت جو کبھی سیکڑوں میں ہوا کرتی تھی، لاکھوں تک پہنچ گئی۔

ملک میں جمہوری حکومتوں کے پہلو بہ پہلو فوجی حکومتیں بھی قائم ہوتی رہیں اور اس کا آغاز 1958 میں ایوب خان کی فوجی حکومت سے ہوا جس نے ملک میں پہلا مارشل لا نافذ کیا۔ پہلے فوجی حکومت کے قیام کے بعد بھی ملک کو فوجی حکومتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ایسے تمام مواقع پر اخبار کو بھی مشکل دور سے گزرنا پڑا۔ تاہم میر خلیل الرحمان کی معاملہ فہمی اور دور اندیشی نے ہر مشکل گھڑی کو انتہائی خوش اسلوبی اور سکون سے گزار دیا۔

میر خلیل الرحمان جدید ٹیکنالوجی کی اہمیت سے واقف رہتے ہوئے اُس سے ہمہ وقت استفادہ کرنے کی جستجو میں لگے رہتے۔ انہوں نے اخباری دنیا میں نوری نستعلیق کو رائج کر کے گویا ایک انقلاب برپا کر دیا۔ اخبار کی وساطت سے میر خلیل الرحمان نے دنیا بھر کی سیر کی، سربراہان مملکت سے ملاقاتیں کیں، مختلف ممالک کی معیشتوں کا مطالعہ کیا، سفارتی تعلقات کی نزاکتیں اور باریکیاں سمجھیں، متضاد کیفیتوں اور صلاحیتوں کے حامل افراد کی صحبتیں اختیار کیں، غرض ہر پل اکتساب اور اپنا احتساب شعارِ زیست قرار دیا۔ تقسیم ہند سے قبل ایک مختصر سی جگہ کے ساتھ صحافت کی دنیا میں قدم رکھنے والے میر خلیل الرحمان نے تدبر، فراست، ذہانت اور محنت سے رفتہ رفتہ دفتر کو توسیع دی اور پھر دفتر ایک ادارے میں تبدیل ہوا اور ادارہ ایک صنعت کی شکل اختیار کر گیا۔ ایسی

صنعت جس سے ہزارہا افراد کا روزگار وابستہ ہوا۔

روزنامہ جنگ کراچی کے بعد روزنامہ جنگ راولپنڈی، روزنامہ جنگ لاہور، روزنامہ جنگ کوئٹہ، روزنامہ جنگ ملتان، اسی کے ساتھ مختلف شہروں میں شام کے اخبارات کا اجراء، پھر انگریزی اخبارات کا اجراء، غرض اشاعت اب تجربے کی مرہون منت تھی۔

میر خلیل الرحمان نے قائداعظم محمد علی جناح سے لے کر میاں نواز شریف اور بے نظیر بھٹو تک وقت کے مختلف صدور اور وزرائے اعظم کا سامنا کیا اور ہر ایک سے خوشگوار مراسم استوار کیے۔ ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آنے والے میر خلیل الرحمان کے دل میں اول و آخر پاکستان کی محبت موجزن رہی۔ محنت پر ایمان اور دیانت پر ایقان رکھنے والا یہ صاحب کمال اور درخشندہ مثال شخص 25 جنوری 1992 کو کراچی میں انتقال کر گیا۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

ناصر کاظمی:

جذبوں کو دھیمی آنچ دکھانے والا جدید غزل گو

قیامِ پاکستان کے بعد اُفقِ شعر پر، جو نام آب و تاب کے ساتھ جگمگائے، ان میں ناصر کاظمی سرِ فہرست ہیں۔ وہ انبالہ، مشرقی پنجاب (بھارت) میں 1925ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا، سید شریف الحسن، انبالہ کے چند نامور رئیسوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ اُن کے والد، سید محمد سلطان، گریجویٹ تھے۔ وہ پولیس اور فوج سے بھی وابستہ رہے۔ انہیں گھڑ سواری کا شوق تھا۔ کئی ممالک کے سفر کیے۔ ناصر کی والدہ صاحبِ ذوق خاتون تھیں اور میر تقی میر، میر حسن اور میر انیس جیسے اساتذہ سخن کے کلام کی مداح۔ اُن ہی سے ناصر کی طبیعت شعروادب کی طرف مائل ہوئی۔ والدہ سے یہ ذوق اس حد تک ناصر میں سرایت کر گیا کہ اُن سے شعروسخن کے سلسلے میں مشورے بھی لینے لگے۔ اگرچہ باقاعدہ طور پر وہ حفیظ ہوشیار پوری سے مشورہ سخن کیا کرتے۔ یہ وہ دور تھا، جب ناصر اوائلِ عمری کے ادبی ذوق کے تحت چھوٹی چھوٹی نظمیں کہا کرتے تھے۔ 1937ء میں محض تیرہ برس کی عمر میں، ایک وارداتِ قلبی کے زیرِ اثر ناصر، داستانِ دل کو بیان کرنے کے لئے غزل کا سہارا لینے پر مجبور ہوئے اور جس رنگ کو اختیار کیا، وہ اس دور کے مشہور رومانی شاعر، اختر شیرانی کا تھا۔ اگرچہ یہ تمام دور شعروسخن سے عبارت تو ضرور تھا، مگر ابھی تک شاعر کی شعری لفظیات شناخت کی منزل سے دور تھیں۔ انبالہ، شملہ اور لاہور میں تعلیمی مدارج طے کرنے کے بعد ناصر 1945 میں واپس انبالہ پہنچے اور آبا و اجداد کی پشتینی زمینوں کی دیکھ بھال کا کام شروع کر دیا۔

برصغیر کی سیاسی فضا پُر آشوب ہو چلی تھی۔ حُریت پسند آزادی سے جینے کا مطالبہ کر رہے تھے اور بالآخر وہ دن بھی آ گیا، جب ہندوستان دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ تقسیمِ ہند ایک ایسا تجربہ تھا، جس نے عوام و خواص کے وجود کو ہلا کر رکھ دیا۔ یہ تقسیم، نہ صرف معاشرت پر اثر انداز ہوئی، بلکہ اس

نے تہذیب وتمدن اور ادب کو بھی متاثر کیا۔ ناصرؔ ایک حساس دل کے مالک تھے، لہٰذا یہ ناممکنات میں سے تھا کہ وہ ہجرت اور اس کے مسائل سے چشم پوشی اختیار کرتے۔ ہجرت نے نہ صرف ناصرؔ کے لہجے ہی کو تبدیل کیا، بلکہ زندگی کے معمولات بھی یکسر بدل کر رکھ دیے۔

تجھے تو خیر وطن چھوڑ کر اماں نہ ملی
وطن بھی، مجھ سے غریب الوطن کو، ترسے گا

شکستہ پا، رہ میں کھڑا ہوں، گئے دنوں کو، بلا رہا ہوں
جو قافلہ میرا ہمسفر تھا، مثالِ گردِ سفر گیا وہ

تیرگی ختم ہوئی، صبح کے آثار ہوئے
شہر کے لوگ، نئے عزم سے بیدار ہوئے

جگمگانے لگیں، پھر میرے وطن کی گلیاں
ظلم کے ہاتھ سمٹ کر، پسِ دیوار ہوئے

قیامِ پاکستان کے بعد ناصرؔ نے لاہور کو اپنا مسکن بنایا۔ وہ لاہور، جو شعر وسخن کی آبیاری اور ادبی شخصیات کی دلداری میں، ہمیشہ کشادہ دل رہا۔ قیامِ لاہور کے ابتدائی دنوں میں ناصرؔ صحافتی امور میں مصروف رہے۔ اس دوران وہ ''اوراقِ نو'' میں مدیر اور ''ہمایوں'' میں مدیرِ اعلیٰ کے طور پر خدمات انجام دیتے رہے۔ بعد ازاں وہ ریڈیو پاکستان لاہور سے بھی وابستہ رہے۔ یہ تمام روزگاری مشاغل ناصرؔ کی بے قرار روح کو جزوی طمانیت تو عطا کرتے رہے، مگر شادمانی کو طولانی نہ بنا سکے۔ بالآخر، بے قرار طبیعت نے فرحت کے لئے، مستقل طور پر اور بالارادہ غزل کا جادہ اپنا لیا۔ اب غزل ناصرؔ کا پیراہن اور دل کی ترنگ آمادۂ سخن تھی۔ کارِ غزل، ناصرؔ کے لئے اپنے کو بازیافت کرنے کا عمل تھا۔ ایک ایسا عمل، جس سے گزرنا اور جس کو برتنا ہر حساس دل کی خواہش ہوتی ہے۔ مگر جس کا بیان، تجربے کی سان کا محتاج ہوتا ہے۔ جس سے ناصرؔ خوب واقف تھے۔

دل دھڑکنے کا سبب یاد آیا
وہ تری یاد تھی، اب یاد آیا

تنہائیاں، تمہارا پتا پوچھتی رہیں
شب بھر تمہاری یاد نے سونے نہیں دیا

یاد ہیں مرحلے محبت کے
ہائے اس بے کلی میں کیا کچھ تھا

ناصؔر کاظمی نے اپنے لہجے سے اپنی شناخت بنائی۔ نئی مملکت میں نئی آوازوں کے ہجوم میں ناصؔر کی آواز کی دھوم تھی۔ اگر چہ ناصؔر کی شعری تربیت اردو کے نامور شاعر حفیظ ہوشیار پوری نے کی مگر اس سے فزوں تر بات یہ تھی کہ اُن کی ذہنی تربیت خدائے سخن، میر تقی میؔر کے اشعار کے زیر سایہ ہوئی تھی۔ شاید یہی سبب ہے کہ میؔر کا گداز جدید عہد میں ناصؔر کے لہجے اور آواز میں سامنے آیا۔

آؤ کچھ دیر رو ہی لیں ناصؔر
پھر یہ دریا اتر نہ جائے کہیں

اس شہر بے چراغ میں جائے گی تو کہاں
آ اے شب فراق، تجھے گھر ہی لے چلیں

روداد سفر نہ چھیڑ ناصر
پھر اشک نہ تھم سکیں گے میرے

مختصر بحر اور ناصؔر کی طبیعت کی لہر کلام کو ہوا کے دوش پر اڑا کر لے جاتی رہی

جب ذرا تیز ہوا ہوتی ہے
کیسی سنسان فضا ہوتی ہے

دل تو میرا اُداس ہے ناصرؔ
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

دل چمکنے لگا ہے آنکھوں سے
اب کسے رازداں کرے کوئی

آؤ ناصرؔ، کوئی غزل چھیڑیں
جی بہل جائے گا ارے کچھ تو

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصرؔ
اُداسی بال کھولے سو رہی ہے

اب ناصرؔ کی غزل کی پرواز کوئل اور فاختہ کی پرواز کے مانند تھی۔

سب اپنے گھر میں لمبی تان کے سوتے ہیں
اور دور کہیں، کوئل کی صدا کچھ کہتی ہے

ان کے یہاں پرندے اور درخت شاعری کی روایت سے نہیں، بلکہ شاعر کی فطرت سے محبت کے سبب دکھائی دیتے ہیں۔ ناصرؔ ایک موقع پر کھلتے ہوئے پھول کو اپنا معاصر قرار دیتے ہیں۔

دن کا پھول ابھی جاگا تھا
دھوپ کا ہاتھ بڑھا آتا تھا

درخت، پرندے، موسم، ستارے، چاند ان کے اشعار میں چلتے پھرتے اور بولتے نظر آتے ہیں۔ ان سب سے ناصرؔ کا یارانہ ہے اور شاعر ان سب کا دیوانہ ہے۔ ان کے درمیان رہنا اور ان سے دل کی بات کہنا شاعر کا سب سے اچھا مشغلہ ہے۔

ٹھنڈی دھوپ کی چھتری تانے
پیڑ کے نیچے پیڑ کھڑا تھا

چاند نکلا تھا مگر رات نہ تھی پہلی سی
یہ ملاقات، ملاقات نہ تھی پہلی سی

شاید اسی سبب سے شاعر کی شخصیت اس کی شاعری کا توسیعی اور توثیقی حصہ ہے۔ شاعری اس کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ نصف شب، شہر کی سڑکوں پر بظاہر بے مقصد آوارگی، بباطن چاند ستاروں کا مشاہدہ اور اس مشاہداتی منظر کو شعر میں سمونے کا سلسلہ ہے۔

جب سے دیکھا ہے ترے ہاتھ کا چاند
میں نے دیکھا ہی نہیں رات کا چاند

مارچ 1972 میں لاہور میں اُفقِ شعر پر آب و تاب سے جگمگانے والا یہ ستارہ کہیں دور جا کر ڈوب گیا۔

ناصر یہ شعر کیوں نہ ہوں، موتی سے آبدار
اس فن میں کی ہے میں نے، بہت دیر جاں کنی

ناصر کی تخلیقات میں برگِ نے (1952)، دیوان (1972)، پہلی بارش (1975)، نشاطِ خواب (مجموعہ نظم) 1977، سُر کی چھایا (منظوم ڈراما) 1981، خشک چشمے کے کنارے (نثری مضامین) 1982، ناصر کاظمی کی ڈائری (چند پریشاں کاغذ) خودنوشت 1995 وغیرہ اردو ادب کے متوالوں کو ہمہ وقت اُن کی یاد دلاتی رہیں گی۔

☆☆☆☆☆

آبِ حیات: محمد حسین آزاد کے قلم کا معجزہ

اُردو ادب کی بہترین کتاب: میری نظر میں (اخبار کا ادبی سلسلہ)

اچھی کتاب کا مطالعہ کسی بھی شخص کے علم میں خاطر خواہ اضافے کا سبب بنتا ہے۔ تاہم، اگر کتاب مولانا محمد حسین آزاد جیسے صاحب قلم کی تصنیف ہو تو علم میں اضافے کے ساتھ زبان و بیان کی چاشنی مطالعے کے لُطف کو دوبالا کر دیتی ہے۔ اور سونے پر سہاگہ، اگر پسندیدہ کتاب اُن ہی کی "آبِ حیات" ہو تو کیوں نہ لُطفِ حیات دو چند ہو جائے" آبِ حیات" میری پسندیدہ کتاب کیوں ہے؟ اس کا جواب ذیل میں دیا جاتا ہے۔ تاہم، اس سے پیشتر مناسب ہو گا کہ آزاد کے تعلق سے کچھ عرض کر دیا جائے۔۔ آزاد 5 مئی 1828 کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد، مولوی محمد باقر اچھے انشا پرداز اور جرأت مند صحافی تھے، جنہوں نے "دہلی اخبار" کے نام سے ایک اخبار کا اجراء کیا، جسے بعض ناقدین، اردو کا پہلا مکمل اخبار قرار دیتے ہیں۔ اُس اخبار میں سیاست، ادب اور تعلیم کے ساتھ قلعۂ معلیٰ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کی بھی خبریں ہوتی تھیں۔ ان خبروں میں حکومت کی بدانتظامی اور عمومی نقائص کی طرف متوجہ کیا جاتا تھا۔ خبروں کے انداز میں بے باکی کی وجہ سے اخبار کو عوام میں خاطر خواہ پذیرائی حاصل ہوئی۔ یہ اخبار بعد ازاں "دہلی اردو اخبار" کے نام سے شائع ہونے لگا۔ غدر 1857 میں مولوی محمد باقر کی انگریز دشمنی پر مبنی خبروں کی اشاعت سے مشتعل ہو کر انگریز سرکار نے اُنہیں شہید کر دیا۔ مولوی محمد باقر کے سب سے عزیز دوست، شیخ محمد ابراہیم ذوق تھے، جنہوں نے آزاد کی پیدائش کی تاریخ بھی کہی تھی۔ دہلی کالج سے تعلیم کی تکمیل کے بعد آزاد مستقل طور پر ذوق کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے اور یہ سلسلہ اُن کی حیات تک جاری رہا۔ آزاد عربی اور فارسی کے جید عالم ہونے کے علاوہ سنسکرت، بھاشا اور

انگریزی سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔ لسانیات دلچسپی کا ایک اور میدان تھا۔ "سخندان فارس" اس کی پوری طرح تصدیق کرتی ہے۔ "آئینۂ صحت" لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے لیے تحریر کی گئی کتاب ہے۔ "نیرنگِ خیال"، "قصصِ ہند" اور ان کے علاوہ تحریر کی گئیں بہت سی کتب آزاد کو نابغہء روزگار ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔

"آبِ حیات" میں اُردو زبان کی تاریخ، اُس کا فارسی، ہندی اور دیگر زبانوں سے اثرات قبول کرنے کا بیان، اُردو کی تصانیف، لفظ کی تذکیر و تانیث کا احوال، متروک الفاظ کا بیان، ادبی لطائف اور واقعات کا ایک تسلسل ہے۔ تاہم میرے لئے اس کی سب سے پُرکشش بات آزاد کا طرزِ بیان ہے۔ شعراء کے عہد بہ عہد تذکرے میں شعراء کو اُن کے مزاج و معیار سے جانچنا اور ضبطِ تحریر میں لانا اُن کا کمال ہے۔ مثال کے طور پر میرؔ کے لئے تحریر کرتے ہیں: "غرض ہر چند کہ تخلص اُن کا میرؔ تھا، مگر گنجفۂ سخن کی بازی میں آفتاب ہو کر چمکے۔ قدر دانی نے اُن کے کلام کو جواہر اور موتیوں کی نگاہوں سے دیکھا اور نام کو پھولوں کی مہک بنا کر اڑایا۔ ہندوستان میں یہ بات انہی کو نصیب ہوئی ہے کہ مسافر غزلوں کو تحفہ کے طور پر شہر سے شہر میں لے جاتے تھے"۔ جراَتؔ اور رنگینؔ کے دور کو بیان کرتے ہوئے ان شعراء کی خوبیوں اور خامیوں کو یوں تحریر کرتے ہیں: "قہقہوں کی آوازیں آتی ہیں۔ دیکھنا اہلِ مشاعرہ آن پہنچے، اُن کا آنا، غضب کا آنا ہے۔ ایسے زندہ دل اور شوخ طبع ہوں، گو کہ جن کی شوخی اور طرّاری طبع بار متانت سے ذرا نہ دبے گی۔ اتنا ہنسیں اور ہنسائیں گے کہ منہ تھک جائیں گے مگر نہ ترقی کے قدم آگے بڑھائیں گے، نہ اگلی عمارتوں کو بلند اٹھائیں گے۔ انہی کوٹھوں پر کودتے اور پھاندتے پھریں گے۔ ایک مکان کو دوسرے مکان سے سجائیں گے اور ہر شے کو رنگ بدل بدل کر دکھائیں گے۔ وہی پھول عطر میں بسائیں گے۔ کبھی ہار بنائیں گے، کبھی طرے سجائیں گے، کبھی انہی کو پھولوں کی گیندیں بنا لائیں گے اور وہ گلبازی کریں گے کہ ہولی کے جلسے گرد ہو جائیں گے۔ ان خوش نصیبوں کو زمانہ بھی اچھالے گا۔ ایسے قدر دان ہاتھ آئیں گے کہ ایک ایک پھول اُن کا چمن زعفران کے مول بکے گا"۔

ناسخؔ و آتشؔ کے لئے کہتے ہیں: "دیکھنا وہ لالٹینیں جگمگانے لگیں۔ اُٹھو اُٹھو استقبال کرکے

لاؤ۔ اس مشاعرے میں وہ بزرگ آتے ہیں، جن کے دیدار ہماری آنکھوں کا سرمہ ہوئے۔ اس میں دو قسم کے باکمال نظر آئیں گے۔ ایک وہ کہ جنہوں نے اپنے بزرگوں کی پیروی کو دینِ آئین سمجھا۔ یہ ان کے باغوں میں پھریں گے۔ پرانی شاخیں زرد پتے کاٹیں چھانٹیں گے اور نئے رنگ، نئے ڈھنگ کے گلدستے بنا بنا کر گلدانوں سے طاق وایوان سجائیں گے۔ دوسرے وہ عالی دماغ، جو فکر کے دخان سے ایجاد کی ہوائیں اُڑائیں گے اور برجِ آتش بازی کی طرح اس سے رتبۂ عالی پائیں گے۔ انہوں نے اس ہوا سے بڑے بڑے کام لئے، مگر یہ غضب کیا کہ گردوپیش، جو وسعت بے انتہا پڑی تھی، اس میں سے کسی جانب میں نہ گئے۔ بالا خانوں میں سے بالا بالا اڑ گئے، چنانچہ تم دیکھو گے کہ بعض بلند پرواز ایسے اوج پر جائیں گے، جہاں آفتاب تارا ہو جائے گا اور بعض ایسے اڑیں گے کہ اڑ ہی جائیں گے"۔ سخنوروں کے سرتاج، انیسؔ و دبیرؔ کے ذیل میں لکھا:

"دونوں باکمالوں نے ثابت کر دیا کہ حقیقی اور تحقیقی شاعر ہم ہیں اور ہم ہیں کہ ہر رنگ کے مضمون، ہر قسم کے خیال، ہر ایک حال کا اپنے الفاظ کے جوڑ بند سے ایسا طلسم باندھ دیتے ہیں کہ چاہیں رُلا دیں، چاہیں ہنسا دیں، چاہیں تو حیرت کی مورت بنا کر بٹھا دیں"۔ الغرض "آبِ حیات" اردو شاعری کا ایک ایسا شیریں تذکرہ ہے، جس کی سیر ایک ایسے گلشنِ بے خار میں لے جاتی ہے، جہاں گل و بلبل کی صدائیں سماعت میں ہمہ وقت رس گھولتی رہتی ہیں۔ سو، ہم ایسی دنیا کے باسی، جہاں بارود اور بندوق کی آوازیں ہمارا تعاقب کرتی رہتی ہیں، سکون کی جا تلاش کرنے کے لئے "آبِ حیات" کے چند گھونٹ پی کر تسکین حاصل کر لیتے ہیں۔

صبحِ آزادی کی مقدّس کرن

شعرائے اُردو کے حُرّیت پسندانہ کلام کا ایک جائزہ

سرزمینِ ہند اپنے طویل جغرافیے اور وسیع تجارتی منڈی کے باعث ترقی پسندانہ و توسیع پسندانہ عزائم رکھنے والے ممالک کے لئے ہمیشہ سے پُرکشش رہی تھی۔ سترہویں صدی میں برصغیر کا رُخ کرنے والی ایسٹ انڈیا کمپنی اگر تجارت کو اپنے قدم جمانے اور کمانے کا مقصد قرار دیتی تو اس میں کسی سازش کی بُو محسوس کرنا بے وقت کی راگنی ہی قرار دیا جاتا، مگر کمپنی نے تجارت کے پردے میں عداوت اور شقاوت کا کاروبار شروع کر دیا تھا۔ مقامی لوگوں کو بے اثر کرنا، اُن میں وطن سے بیگانگی کے احساس کو فروغ دینا اور انہیں بدیسی ترقی اور کمال کا اسیر رکھنا ایک طویل منصوبے کا حصّہ اور قصّہ تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے بعد برطانوی راج بھی مقامی سماج سے دشمنی پر تُل گیا، جس کا احوال اہلِ ہند پر جلد ہی کھل گیا۔ جب عام لوگ یہ بات محسوس کر سکتے تھے تو سماج کا ایک حسّاس طبقہ، جسے شعراء کہا جاتا تھا، کیسے بے نیاز رہ سکتا تھا، چنانچہ اُن کے یہاں گاہے گاہے غیر مقامی افراد کے خلاف جذبات کا اظہار دیکھنے میں آتا رہا۔ میر انیسؔ نے ایک رباعی میں ایسی ہی کسی کیفیت کے زیرِ اثر کہا تھا۔

کیوں کر نہ دلِ غمزدہ فریاد کرے
جب ملک کو یوں غنیم برباد کرے
مانگو یہ دُعا کہ اب خداوندِ کریم
اُجڑی ہوئی سلطنت کو آباد کرے

یا خاکِ امروہہ کے قابلِ فخر سپوت، شیخ غلام ہمدانی مصحفیؔ نے ایک شعر میں اُس کیفیت کو

سوتے اور روتے ہوئے کہا تھا۔

ہندوستان کی دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی
کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

کچھ اس سے ملتا جلتا نوحہ آخری تاجدار ہند، بہادر شاہ ظفر کا بھی تھا، جو کہتے تھے۔

نہ تھا شہر دہلی یہ تھا چمن، کہ تھا سب طرح کا یہاں امن
جو خطاب اس کا تھا مٹ گیا، فقط اب تو اُجڑا دیار ہے

اودھ کے بادشاہ، واجد علی شاہ اختر بھی اس کرب اور اذیت کو محسوس کر رہے تھے جو مقامی لوگوں پر بیرونی افراد نے حاصل کر لی تھی۔

وسعتِ خلد سے بڑھ کر ہے کہیں حُبِ وطن
تنگیِ گور سے بدتر ہے، فضائے غربت

وقت کے بہتے دھارے نے جب کچھ اور مسافت طے کی تو یہ عقدہ کھلا کہ مقامی اور غیر مقامی یا غیر ملکی باشندوں کے مابین خلیج وسیع سے وسیع تر ہو چکی تھی۔ اگر چہ اُسے پاٹنے کی انگریز ہر ممکن کوشش کر رہا تھا، مگر کوئی کامیابی نہ ہو رہی تھی، حد یہ کہ سیاسی محاذ تو رہا ایک طرف، ادبی میدان بھی غزل کو اور غزل گو کو ناپسندیدہ نظر سے دیکھنے لگا، یہاں تک کہ خواجہ الطاف حسین حالی کو کہنا پڑا۔

اب گئے حالی غزل خوانی کے دن
راگنی بے وقت کی گاتے ہو گیا

یعنی یہ بات طے ہو گئی کہ وہی شاعرانہ کلام مرکزِ خاص و عام ہو گا، جو حُریت کے نام ہو گا۔ اب تھا شاعر کا قلم اور آزادی کی طرف بڑھتا قدم، لیکن فضا سازگار نہ ہونے کے باعث اندیشہ ہائے دُور دراز بھی تھے۔ یہ ایسی گومگو کی حالت تھی کہ شبلی نعمانی بھی کہہ اُٹھے۔

جو ہجرت کر کے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں
کہ اب امن و امانِ شام و نجد و قیرواں کب تک

حُریت کی تحریک تیز سے تیز تر ہو رہی تھی۔ اگر ایک طرف حاکم کا جلال تھا تو دوسری طرف محکوم کا عزمِ لازوال۔ مولانا صفی لکھنوی اگلی صفوں میں شامل ہوتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

اس دین کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
اُتنا ہی یہ اُبھرے گا، جتنا کہ دبا دیں گے

اُس کارواں میں اپنا حصہ ڈالتے ہوئے ممتاز شاعر مصطفیٰ زیدی نے نغمے کو ایک نئی لے دی۔

میں پوچھتا ہوں دوبارہ یہ تم سے پوچھتا ہوں
ہمارے تیر، ہماری کمان کیوں چھینی
کسی کے ہاتھ میں دے کر ہزاروں کرپانیں
ہمارے منہ سے ہماری زبان کیوں چھینی

نسیم امروہوی بھی گونجتے ہوئے سازِ حُریت میں آواز یگانگت کے ساتھ موجود تھے۔

یہی ہے سنورنے، سُدھرنے کا موقع
چمکنے، دمکنے، نکھرنے کا موقع
نہیں چلتے چلتے ٹھہرنے کا موقع
ہر اک گام پر ہے اُبھرنے کا موقع
بنے اب جو راہِ تصادم سے بچ کر
وہ ساحل پہ ڈوبے، تلاطم سے بچ کر

غیر منقسم ہندوستان کے ایک اور جوہرِ قابل، مولانا محمد علی جوہر واضح پیغام دے رہے تھے کہ

اب دشمن کے بھاگنے اور اہلِ وطن کے جاگنے کا وقت آ پہنچا ہے

سونے کا نہیں وقت یہ، ہشیار ہو غافل
رنگِ فلکِ پیر، زمانے کی ہوا دیکھ

انیسویں صدی اسیرِ برِ صغیر کے لئے عزم، جہدِ مسلسل اور حریت کی نوید جاں فزا کی فضا لے کر آئی۔ اقبالؔ قوم کو اپنے مفکرانہ اور دانشورانہ طرزِ اظہار سے بیدار کرنے پر مائل تھے۔ وہ فرنگی سیاست سے قوم کو باخبر کرنے، انہیں ڈوب کر اُبھرنے اور اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کا سلیقہ بہت خوش سلیقگی سے عطا کر رہے تھے۔

اقبالؔ کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا
ایک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو
لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند

اور تمام آوازوں میں سب سے توانا اور جوشیلی آواز، جوشؔ ملیح آبادی کی تھی۔ اُن کے ترانے سینوں میں آگ لگانے اور حریت کے پرچم کو اونچا اُڑانے کا ایک مسلسل پیغام تھا، جو ہر خاص و عام کے نام تھا۔

کس زباں سے کہہ رہے ہو آج تم سوداگرو
دہر میں انسانیت کے نام کو اونچا کرو
ذہن میں ہو گا یہ تازہ ہندیوں کا داغ بھی
یاد تو ہو گا تمہیں جلیانوالہ باغ بھی

مولانا ظفر علی خان بے خوف اور بے تکان اور بصد عز و شان مظلوموں کی ہمت بڑھا رہے تھے۔

ادھر ہے جبر کی ارشادِ نو، ادھر ہے صبر کی تلقین
مقابلہ ہے توانا سے ناتوانوں کا
ادھر غرور حکومت کے طنطنے کی نمود
ادھر مظاہرہ دل میں نیم جانوں کا

رئیس قلم، رئیس امروہوی لہجہ حقیقی میں پاکستان کے قیام کی انہونی کے ہونے کی پیش گوئی کرتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

یاد رکھو وقت کا فرمان ٹل سکتا نہیں
موت ٹل سکتی ہے پاکستان ٹل سکتا نہیں

رگوں میں حرارت آزادی کا احساس لیے اور اسلوب خاص لیے فیض بیان کر چکے تھے۔

لیکن اب ظلم کی معیاد کے دن تھوڑے ہیں
اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں

اور جب وہ تھوڑے دن مکمل ہوئے اور آزادی کا سورج اپنی روپہلی کرنوں کے ساتھ افق پر نمودار ہوا تو ایم ڈی تاثیر نے اس کی تصویر دکھاتے ہوئے کہا۔

لہو میں ڈوب کے نکلا ہے آفتاب اپنا
افق پہ داغ اگر ہیں تو کوئی بات نہیں

عبدالمجید سالک نے اہل وطن کو ہدیہ تبریک پیش کرتے ہوئے کہا۔

یہی ہے پھر بھی دعائے عوام پاکستان
مبارک اہل وطن کو قیام پاکستان

شان الحق حقی نے جب مئے آزادی چکھی تو لہجہ شعار میں اظہار کرتے ہوئے گویا ہوئے۔

عہدِ آزادی ہے، غم، رخصتِ رَم لیتا ہے
کارواں چشمۂ جاں بخش پہ دَم لیتا ہے

جگن ناتھ آزاد نے ترانۂ آزادی کی یوں عکاسی

اے سرزمینِ پاک

ذرّے ترے ہیں آج ستاروں سے تابناک
روشن ہے کہکشاں سے کہیں آج تیری خاک
تندیٔ حاسداں سے ہے غالب ترا سواک
دامن وہ سِل گیا ہے، جو تھا مدّتوں سے چاک

اے سرزمینِ پاک

اب اپنے عزم کو ہے نیا راستہ پسند
اپنا وطن ہے آج زمانے میں سر بلند
پہنچا سکے گا اس کو نہ کوئی بھی اب گزند
اپنا علم ہے چاند ستاروں سے بھی بلند
اب ہم کو دیکھتے ہیں عطارد ہو یا سماک

اے سرزمینِ پاک

اُردو غزل کی آبرو اور شاعرِ خوبرو، مجازؔ نے بہ لہجۂ اعجاز پاکستان کا ترانہ ایک ادائے دلبرانہ کے ساتھ تحریر کیا

آزادی کی دُھن میں کس نے آج ہمیں للکارا
خیبر کے گردوں پر چمکا اک ہلال اک تارا
سبز ہلالی۔ پرچم لے کر نکلا لشکر سارا
پربت کے سینے سے پھوٹا کیسا سرکش دھارا
سرمائے کا سرکش جنگل اس میں سرخ شرارا
پاکستان ہمارا پاکستان ہمارا پاکستان ہمارا
سو انجیلوں پر ہے بھاری اک قرآن ہمارا
روک سکا ہے کوئی دشمن کب طوفان ہمارا
ہر ترک اپنا ہر حُر اپنا ہر افغان ہمارا
ہر شخص اک انسان یہاں ہے ہر انسان ہمارا
ہم سب پاکستان کے غازی پاکستان ہمارا
پاکستان ہمارا پاکستان ہمارا پاکستان ہمارا

رات دن سبز ہلالی پرچم کی سلامی کی نیک نامی حفیظؔ کے حصے میں آئی۔

پاک سر زمین شاد باد
کشورِ حسین شاد باد

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر قمر عباس کی آنے والی کتب

☆ روزنامہ جنگ کی ادبی خدمات

(ڈاکٹریٹ کا مقالہ)

☆ ادبی خانوادے

☆☆☆☆☆

☆☆☆☆☆

مصنف کا تعارف

اس کتاب میں شامل مضامین کے مصنف ڈاکٹر قمر عباس نے ۱۹۹۲ء میں جامعہ کراچی سے اردو ادب میں ایم اے کیا۔ ۲۰۱۲ء میں انہیں "روزنامہ جنگ کی ادبی خدمات" کے عنوان سے مقالے کی تکمیل پر پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی۔ وہ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کا وسیع تجربہ رکھتے ہیں۔ گذشتہ دو عشروں سے جنگ گروپ سے وابستہ ہیں۔ متعدد ادبی مضامین تحریر کر چکے ہیں۔ اسی کے ساتھ مختلف ادبی سلسلوں کے نگراں بھی رہے ہیں۔ پیش نظر کتاب ان کے چند منتخب مضامین کا مجموعہ ہے۔ فاضل مصنف کی آنے والی کتابوں میں ان کا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ "روزنامہ جنگ کی ادبی خدمات" اور "ادبی خانوادے" شامل ہیں۔